پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: شخصیت اور فن

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

(سلسلہ ۱۵۶)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: شخصیت اور فن

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

نگرانِ اعلیٰ : ڈاکٹر یوسف خشک
مدیرِ اعلیٰ : محمد عاصم بٹ
مصنف : ڈاکٹر محمد افتخار شفیع
نظرِ ثانی : ڈاکٹر سعادت سعید
طباعت : اختر رضا سلیمی
اشاعت : 2021
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع : نست پریس، اسلام آباد
قیمت : مجلد:-/280 روپے
غیر مجلد:-/240 روپے

ISBN: 978-969-472-502-4

Pakistani Adab Kay Maimar
Dr. A. D. Naseem: Shakhsiyat-aur-fun

Writen By
Dr. Muhammad Iftikhar Shafi

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

فہرست

پیش نامہ

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کو کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان عظیم شخصیات کے زندگی کے مختلف مراحل و منازل کے ساتھ ساتھ ان کے علمی و ادبی کارناموں کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس سلسلے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبہ شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ بہت کامیاب رہا، پاکستان کی قومی زبان اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے مشاہیر کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا۔

معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے علم بردار رہے انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کے تحقیقی گوشوں کی بازیافت کے لیے اہم خدمات انجام دیں وہ ایک خوب صورت اسلوب کے شاعر اور اہم اقبال شناس تھے۔ ایک عظیم استاد جنھوں نے تمام عمر نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت کا فریضہ ادا کیا۔ ایک نامست درویش جو کسی صلے اور ستائش کی تمنا کے بغیر قلم اور قرطاس کی دنیا سے وابستہ رہے۔

اسی اشاعتی منصوبے کے تحت "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: شخصیت اور فن" کے عنوان سے یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ ملک کے معروف شاعر، محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر محمد افتخار شفیع نے اس کی تالیف کی ذمہ داری بخوبی سرانجام دی ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم جس تعلیمی ادارے میں شعبہ اردو کے سربراہ رہے، افتخار شفیع صاحب وہاں انھی کی مسند پر فائز ہیں۔ اس لیے ان سے بہتر اور کون اس موضوع سے انصاف کر سکتا تھا۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کی اس کاوش کو علمی اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر یوسف خشک میر ریٹورلیس پروفیسر
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

میں کالج میں پہلے سال کا طالب علم تھا۔ شہر کے ایک بارونق چوک میں ایک خوش لباس اور وجیہ بزرگ پر نظر پڑی، کسی نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا: "وہ دیکھو! ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ نسیم، ہمارے کالج کے شعبہ اردو کے پہلے سربراہ"۔ ہم بے ساختہ ان کی جانب لپکے، بڑے ادب سے سلام کیا، ان کی شفقت کی نگاہ پڑی، یہ نظر علاج کر گئی۔ وہیں سے تعلق کی ابتدا ہوئی جو بعد میں کسی نہ کسی طرح ان کی وفات تک قائم رہا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ان دنوں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے گھر کے سادہ سے ڈرائنگ روم میں روزانہ ادبی اور روحانی محافل منعقد ہوتیں۔ ہم بھی ان پرنور مجالس میں سائل کی حیثیت سے موجود ہوتے۔ سوادِ تحریر خوب صورت ہونے کے سبب ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی کتابوں کے مسودات کی پروف خوانی راشد سلیم اور میرے ذمے ہوتی تھی۔

اردو تنقید و تحقیق کی روایت میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اہم مقام رکھتے ہیں، ان کی شخصیت کا عکس ان کی تحریروں میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔ ان کا علمی و ادبی کام مذہب و تصوف، کلاسیکی ادب، ادبی روایات کی پاس داری اور مشاہیر کی عزت و احترام کا حامل ہے۔ ان کا مقصد کلاسیکی اردو کے نظرانداز کر دیے جانے والے گوشوں کی بازیافت کر کے اسے جدید دور میں رواج دینا ہے، وہ مشرقی اقدار کا وقار اور تشخص برقرار رکھنے کے داعی ہیں۔ نسیم صاحب برصغیر کے قدیم ادبی و روحانی ماحول میں سانس لیتے ہیں، کہیں بزرگانِ چشت کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو کہیں دوصدی قبل کے دہلی شہر کی شخصیات سے ملاقاتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علامہ اقبال سے ان کی قلبی اور روحانی وابستگی بھی نظر آتی ہے۔ جب مجھے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی طرف سے "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: شخصیت اور فن" کے عنوان سے مختصر تعارفی کتاب لکھنے کی دعوت ملی تو میں نے اسے نسیم صاحب کا روحانی تصرف سمجھا۔

میرے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ جس شخصیت کی محفل میں یہ فقیر "حیرت" کی جملہ کیفیات کے ساتھ علم وادب کے عمل و گو ہر سمیٹتا رہا ہو، آج اپنی کم علمی اور مبتدیانہ حیثیت کے باوجود اسی کی جگہ ملازمتی امور انجام دے رہا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے اس کتابی سلسلے پر کام کرنا بھی میرے لیے کارِ ثواب ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی کچھ کتابیں منظرِ عام پر آئی ہوئی ہیں، بہت سی کتابوں کے مسودات تاحال شائع نہیں ہو سکے۔ اس غیر مطبوعہ مواد تک رسائی ایک مشکل کام تھا، یہاں میں ڈاکٹر نسیم مرحوم کے فرزندِ ارجمند معروف شاعر اور ادیب پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید صاحب کا احسان مند ہوں جنھوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی متعدد کتابیں طبع نہیں ہو سکیں، حکومتی اداروں سے التماس ہے کہ ان کی اشاعت کا اہتمام کریں۔ اپنی گم شدہ اقدار کی بازیافت کے لیے خاص طور پر پی ایچ ڈی کے مقالے کا منظرِ عام پر آنا ضروری ہے۔

میں اکادمی ادبیات پاکستان کے ہر دل عزیز سربراہ پروفیسر ڈاکٹر یوسف خشک صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی انتظامی کاوشوں سے اکادمی کی نیک نامی میں اضافہ کیا ہے۔ علی یاسر مرحوم کتاب کے اشاعتی امور کے دوران میں دنیا سے رخصت ہوئے، ان کی یاد میری ہم رکاب رہی۔ اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر محمد عاصم بٹ صاحب کا ممنون ہوں جن کے یاد دہانی کے خطوط نے مجھے تیز قدم کیا۔ پروفیسر مطلوب حسین، اکامریڈ زکریا خان اور ڈاکٹر جمیل حیات نے مجھے کچھ اہم کتابیں فراہم کیں۔ ڈاکٹر ریاض ہمدانی کا ممنون ہوں جو ہر مرحلے پر کتاب کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ اس کتاب میں بہت سی تحریروں کی عدم دستیابی کی باعث خامیاں رہ گئی ہیں، یہ اعتراف ضروری ہے کہ: شاید آ جائے کوئی آبلہ پا مرے بعد"۔

خدائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری توفیقات میں اضافہ کرے۔ آمین

ناچیز:
ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

سرگزشتِ حیات: نسیم نامہ

علامہ اقبال کی شہرہ آفاق تصنیف ''جاوید نامہ'' میں ایک شہر مرغدین کا ذکر ملتا ہے۔ اس شہر کی زندگی ایک خواب گوں اور طلسمی فضا میں سانس لیتی ہے۔ مرغدین پرشکوہ عمارتوں کا شہر ہے اور اس کے باشندے سنہری شباہتوں کے حامل ہیں۔ یہ خوش شکل، نرم طبیعت، سادہ لباس اور شیریں گفتار ہیں، اس شہر کا علم و ہنر اللہ کی مخلوق کی خدمت میں پنہاں ہے۔ یہ درہم و دینار کی اہمیت سے ناآشنا ہیں۔ اس شہر میں قلم فروشی ممنوع ہے اور یہاں کی گلیاں بھکاریوں کی آوازوں سے ناآشنا ہیں:

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ
از فن تحریر و تشہیر دروغ
نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش
نے صدا ہائے گدایاں درد نوش (1)

اقبال کا یہ تصوراتی شہر مجھے قدیم زمانے کے شہر منٹگمری (اب ساہیوال) کی طرف لے جاتا ہے۔ اس شہر میں علم و دانش کے بہت سے مراکز تھے جہاں آفتاب اور ماہتاب شخصیات جلوہ گر ہو کر علم و دانش کی آبیاری کیا کرتی تھیں۔ ان محترم شخصیات میں مولانا عزیز الدین احمد عطائی (شاگرد گرامی) اور شیخ عطاء اللہ جنوں اپنا شعری سفر تمام کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ نئی اردو نظم کے گل سرسبد مجید امجد (جو محکمہ خوراک میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کی حیثیت سے ساہیوال میں قیام پذیر تھے) دن بھر کی دفتری مصروفیات کے بعد شام کو اپنے سیٹلائٹ ٹاؤن (اب فرید ٹاؤن) کے کوارٹر نمبر ۴۰-اے سے پرانی ریلے سائیکل پر آہستہ آہستہ رواں ہوتے۔ ان کا ٹھکانا کیفے ڈی روز یا سٹیڈیم ہوٹل ہوتا، جہاں نئی نسل کے نمائندہ لوگ (طارق عزیز نیلام گھر والے، قیوم صبا، جیم جوزی، اشرف قدسی، سجاد میر، عباس اطہر، سعادت سعید، قاضی حبیب الرحمٰن، مظہر ترمذی وغیرہ) ان کے گرد جمع ہوتے۔ اس کے علاوہ زندگی

کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ وکلا، صحافی، دفتروں کے بابو، سیاسی و سماجی کارکن اور تعلیمی مراحل سے سبک دوش ہو کر ملازمت کی تلاش کرنے والے نوجوان بھی اس علمی و ادبی مباحث میں شامل ہو جاتے۔

اس مقام سے کچھ فاصلے پر شہر کے مرکزی چوک میں "مکان شریفی" نام کی ایک حویلی میں نقش بندیہ سلسلے کے بزرگ اور معروف نعت گو سید منظور احمد مجور قیام پذیر تھے، سید صاحب کی ادبی اور روحانی محفلیں شہر کی جان تھیں۔ جعفر شیرازی اور گوہر ہوشیار پوری اپنے ملازمتی امور کے سلسلے میں اپنے گھر سے دور شہر بہ شہر پردیس کاٹ رہے تھے۔ ان کا ادبی اور شعری سفر ان کی الگ پہچان بن رہا تھا۔ بشیر احمد بشیر شہر سے متصل گاؤں میں شاعری کی چودھار میں کھوئے ہوئے تھے۔ مراتب اختر، ناصر شہزاد اور محمود علی محمود جدید تر شاعری میں مضامین نو کے انبار لگا رہے تھے۔ اسی دور میں علاقے کی اہم ترین تعلیمی درس گاہ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے شعبہ اردو کے اولین سربراہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی ان شخصیات میں شامل تھے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کو اردو شاعری کے صوفیانہ عناصر سے خصوصی دل چسپی تھی۔ ان کی زندگی میں بھی تصوف کی عملی صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ علمی اور روحانی حلقوں میں انھیں خصوصی مقام حاصل تھا۔ اس ادبی منظر نامے میں وہ سب سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم عملی آدمی تھے، ان کے شام و سحر خالص علمی مشاغل میں بسر ہوتے، انھوں نے ہنگامۂ شہر سے الگ ایک محفل جمائی ہوئی تھی، ایک انوکھے انداز کی اخوان الصفا مرتب ہو رہی تھی۔ شام کے وقت عالی رود ساہیوال پر واقع ڈاکٹر صاحب کے گھر کے چھوٹے سے مہمان خانے میں ادبی محافل منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے ہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لوگ حاضر ہوتے، بڑے بڑے مسائل آن واحد میں حل کر لیے جاتے۔ ان کے شاگرد وہاں کی لحاظ سے مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سیاست دان، تاجر، وکلا، اساتذہ اور بیوروکریٹس بھی شامل تھے۔ ان کے گھر کے مہمان خانے میں عصر سے مغرب تک علم و ادب کے تشنگان کا اژدہام ہوتا۔ ان محافل میں ڈاکٹر نسیم کی حیثیت پیر مغاں کی سی تھی۔ وہ ایک ایسے مرد خلیق تھے جو ایک ماہر نفسیات کی طرح مجلس میں شریک لوگوں کے مزاج کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے۔ عام طور پر حاضرین مجلس کی علمی استعداد کو سامنے رکھ کر بات چیت کی جاتی تھی۔ بقول علی رضا احمد:

> معاشرے کے مختلف لوگ جن میں اسٹوڈنٹس، پروفیسرز، عام مزدور، کسان بھی
> شامل تھے سارا دن ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ ان سے ان کے درجے کے
> مطابق بات کرتے، سب سے آخر میں پندرہ بیس منٹ میں اپنا نقطہ نظر بیان
> کرتے جو بڑا جذباتی اور پر تاثیر ہوتا۔ وہ بڑے بدیع الاسلوب تھے اور گفت گو
> میں جس موضوع پر بات چل رہی ہوتی ویسے ہی اس کے ریفرنس دیتے، یہ
> بات چیت بڑی عام فہم ہوتی اور ہر کسی کو بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی۔ (۲)

واصف سجاد ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علم و دانش سے معمور مجالس میں حاضر ہوتے رہے۔ ایک مضمون میں وہ اپنی سنہری یادوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> ساہیوال شہر کے قلب میں حالی سے منسوب سڑک پر ایک پرانی وضع کے مکان پر
> ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے نام کی تختی آج بھی آویزاں ہے۔ اس سڑک پر بہت چہل
> پہل ہے، لیکن جب یہ شہر اتنا پر ہجوم نہیں ہوا تھا اور جب اس کے سایوں میں غم
> دنیا نہیں، غم دل تھا تو حالی روڈ پر واقع یہ مکان اس وقت گھر ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر
> الف۔ د۔ نسیم کی سانسوں سے مہکتا ہوا گھر، دروازے پر دستک دیتے ہی ایک
> وجیہ شخصیت، علم کی روشنی سے چمکتا ہوا چہرہ آنے والوں کا استقبال کرتا۔ میرا
> ڈاکٹر صاحب سے تعارف کالج کے دور میں ہوا جب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر
> کر رہے تھے اور ہمہ وقت اردو زبان کی خدمت اور اپنی درویشی اور صوفیانہ طرز
> حیات کا فیض عام کرنے میں مگن رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ملنے والوں میں
> طلبہ، کالج کے پروفیسر اور شہر کے شاعر، ادیب شامل تھے۔ سب ڈاکٹر صاحب کی
> علمی، ادبی گفتگو سے اپنے اپنے ظرف کے مطابق آگہی کشید کرتے۔ (۳)

پیدائش

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم برٹش انڈیا میں پنجاب کے شہر ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ اس شہر میں بارشوں کی مدھر جل ترنگ کانوں میں رس گھولتی تھی۔ اس کا دائرہ اثر کوہ شوالک کی پہاڑیوں سے لے کر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں تک وسیع ہے۔ یہ آم کے باغات پر مشتمل ایک صحت افزا اور زرخیز علاقہ ہونے کے

بااوصف جنت نہیں تو جنت نشاں ضرور سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بڑی حسرت سے اپنے علاقے کی خوب صورت یادوں کا تذکرہ کرتے۔ اپنے آبائی شہر ہوشیار پور کا تذکرہ کے دوران میں ان کی آنکھوں میں یادِ ماضی کے ننھے ننھے سے جگنو روشن ہوجاتے۔ الف۔ د۔ نسیم کا تعلق وہیں کے ایک معزز افغان ننگے زئی خاندان سے تھا۔ وہ خود کہتے ہیں:

> میرے بزرگ جو افغان قبیلے یوسف زئی کی شاخ ننگے زئی سے تعلق رکھتے تھے، نہ جانے کب سے یہاں آباد ہوئے تھے۔ البتہ میرے دادا کا، میرے باپ کا اور میرا مولد یہی شہر (ہوشیار پور) ہے۔ (۴)

ایک اور جگہ ان کی پیدائش کا سال یوں درج ہے۔

> ڈاکٹر نسیم مرحوم کی پیدائش کا سال ۱۹۲۰ء ہے (۵)

والدین

انسانی تربیت میں ماں کا کردار اولین معظم کا ہے۔ الف۔ د۔ نسیم کی والدہ محترمہ نے یہ کردار خوب نبھایا۔ ان کا اسم گرامی رمضان بی بی تھا۔ نسیم صاحب کی شخصیت سازی میں والدہ محترمہ رمضان بی بی کا بنیادی کردار تھا۔ وہ ایک درویش صفت خاتون تھیں۔ بہ ظاہر تو انھوں نے کسی تعلیمی ادارے سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی لیکن وہ ایک باشعور، پاک باز اور جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ وہ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھیں اور انھوں نے صوفیانہ ادب کا بہ غور مطالعہ کر رکھا تھا۔ مختلف فارسی اور اردو شعرا کے دواوین ان کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ الف۔ د۔ نسیم ایک جگہ اپنی شخصیت میں والدہ کے نفوذ کے بارے میں کہتے ہیں:

> میرے مذہب اور تصوف کی طرف جھکاؤ میں میری درویش صفت والدہ کی تربیت کا خاصا عمل دخل ہے۔ وہ تصوف کے سلسلۂ چشتیہ سے وابستہ تھیں ان کے مرشد خواجہ محمد دیوان چشتی صابری تھے جو حافظ کرم بخش چشتی صابری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ میں بھی دیوان صاحب کا مرید ہوں۔ میری والدہ کو صوفیانہ اور مذہبی شعر و ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ ان کے سرہانے سلطان باہوؒ، بابا بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، میاں محمد بخشؒ، بابا فریدؒ کا کلام موجود رہتا تھا۔ وہ قرآن و

حدیث کی کتب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ کشف المحجوب (داتا گنج بخش) اور
منطق الطیر (فرید الدین عطارؒ) کے تراجم کا مطالعہ بھی کیا کرتی تھیں۔ ان کی
تقلید میں میں نے بھی صوفیانہ اور مذہبی ادب کی جانب توجہ کی۔(۶)

ڈاکٹر صاحب کے والدِ گرامی شیخ شیر محمد ہوشیار پور شہر کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ وہ تجارت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ خاندان کے دیگر ارکان بھی عموعی طور پر کاروبار سے منسلک تھے۔ زندگی کا نظام بطریق احسن چل رہا تھا۔ اس دوران میں شیخ شیر محمد کے گھرانے پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ پے در پے حادثات نے گھر کے سربراہ کی زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔ ان صدمات نے شیخ شیر محمد کو گوشہ نشین بنا دیا۔ کاروبار میں دل چسپی ختم ہو گئی۔ اولاد کی وفات کے غم سے ان کی بینائی بھی جاتی رہی۔ نتیجے کے طور پر گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کہتے ہیں:

> اس عرصے میں ہمارے ہاں المیہ ہوا۔ میرے تین بھائی بارہ بارہ چودہ چودہ سال کے ہو کر فوت ہو گئے۔ ایک بیاہی ہوئی بہن اور ایک ان بیاہی جواں سال بہن فوت ہو گئی۔ اس موت کے کھیل میں میرے والدین حوصلہ اور شکیب کی بازی ہار بیٹھے۔ والدہ نے تو پھر بھی باقی ماندہ بھائیوں اور بہنوں کو پالنے کے لیے جن میں سب سے بڑا تھا، بہت حوصلے، صبر اور جوشِ عمل سے کام لیا لیکن والد صاحب ترکِ دنیا کر بیٹھے۔ کاروبار ختم ہو گیا۔ سربراہِ خاندان اب دکان کی بجائے تکیوں دائروں میں بیٹھنے لگے۔ بچی کھچی دولت سے گھر کا دھندا چلتا رہا لیکن کب تک۔(۷)

تعلیمی مراحل

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی ابتدائی تعلیم ہوشیار پور سے شروع ہوئی۔ سکول اور کالج کی تعلیم کے مراحل وہیں سے طے ہوئے۔ اپنے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

> میں بہت زیادہ امیر گھر سے تعلق تو نہیں رکھتا تھا البتہ میرا تعلق ایک آبرومندانہ زندگی گزارنے والے گھر سے ضرور تھا۔ میرے والد مرحوم شیخ شیر محمد اور دوسرے

بزرگ سب کاروباری لوگ تھے۔ مجھے بچپن سے ہی تعلیم کی طرف رغبت تھی۔ میں نے اپنی والدہ سے سنا ہے کہ ان کے مرشد خواجہ محمد دیوان چشتی رحمۃ اللہ علیہ میرے بچپن میں میرے گھر آئے تھے تو میری بوا میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں کہ یہ بچہ تو یونہی رول بولا سا لگتا ہے۔ اس پر بادی برحق نے جوش میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تھا نہیں بی بی یہ بہت پڑھے گا (۸)

الف۔ د۔ نسیم اپنی خود نوشت "موجِ نسیم" میں رقم طراز ہیں:

> "میرے بچپن لڑکپن اور عنفوان شباب کا زمانہ اسی شہر (ہوشیار پور) کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ میں نے میٹرک اسلامیہ ہائی سکول ہوشیار پور اور ایف۔اے گورنمنٹ انٹر کالج ہوشیار پور سے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء میں کیا۔ مجھے سکول کے زمانے کی کوئی اہم بات تو یاد نہیں البتہ مجھے اپنے شفیق استاد، بہت ہی قابل ہیڈ ماسٹر اور کچھ ہم جماعت ضرور یاد آتے ہیں"(۹)

کالج کے زمانے میں نسیم صاحب کا واسطہ شفیق اساتذہ سے پڑا۔ ان میں ہندوستان کے معروف مورخ سیتا رام کوہلی، سلیم تاپانی، شیخ عبدالحق اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق شامل تھے۔ ان اساتذہ میں غلام جیلانی برق نے نسیم صاحب کی افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے انھیں شعر گوئی کی طرف متوجہ کیا۔ "موجِ نسیم" میں ڈاکٹر صاحب اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> میرے شفیق استاد غلام جیلانی برق تھے جو پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کہلانے لگے تھے، کیمبل پور (اٹک) کے رہنے والے تھے اور اب انھیں چند سال ہوئے طویل عمر پا کر فوت ہوئے ہیں۔ انھوں نے میرے شاعرانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے کہا کہ تم شعر کہا کرو۔ میں نے کہا کس طرح؟ کہنے لگے دوسروں کی غزلیں لے کر ان کی پیروی قسم کے شعر کہنے شروع کر دو۔ اس طرح شعر کے آہنگ کا احساس پیدا ہو جائے گا اور طبیعت کو موزوں بنا دے گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔(۱۰)

نسیم صاحب نے گورنمنٹ انٹر کالج ہوشیار پور سے ایف۔اے کیا تھا کہ والد صاحب کی بینائی چھن جانے کے سبب گھریلو امور کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آن پڑیں، مجبوری کے عالم میں

مزید تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ رہا۔ مصائب کے در وا ہو گئے۔ انھوں نے ایک بہادر انسان کی طرح ان مشکلات کا سامنا کیا۔ روزگار کے مسائل کے باوجود تحصیلِ علم کا شوق برقرار تھا۔ ہوشیار پور سے لاہور کا سفر کیا اور اس شہر کو اپنا مامن و مسکن بنایا۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں کی روداد یوں بیان کرتے ہیں:

> مجھے ایف۔ اے کے بعد پڑھائی چھوڑنی پڑی اور میں ملازمت کی تلاش میں صرف اٹھارہ برس کی عمر میں نکل کھڑا ہوا۔ اور مختلف جگہوں پر ملازمتیں کرتا ہوا گھر کے خرچ کو چلاتا ہوا پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے لاہور آ گیا۔ اس سارے عرصے میں میرے اندر سے ایک آواز مجھے کہتی رہی کہ تجھے استاد بن کر جینا ہے اور اس کے لیے نہ صرف خود بلکہ اوروں کو بھی پڑھانا ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا، میں صرف ایف۔ اے تھا اور اس زمانے میں کوئی بھی امتحان پرائیویٹ حیثیت سے نہیں دے سکتے تھے۔ کالج میں داخل ہونے کی نہ سکت تھی نہ حالات تھے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ایک راستہ پرائیویٹ امتحان پاس کرنے کا ہے تو وہ کیوں اختیار نہیں کرتے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اگر میں منشی فاضل، جو ایم اے فارسی کے برابر ہوتا تھا کا امتحان پرائیویٹ پاس کراوں تو صرف انگریزی کے تین پرچے دے کر میں بی اے ہو سکتا ہوں۔ چناں چہ میں نے منشی فاضل کے لیے تیاری شروع کر دی اور اس وقت کے معروف سکالر آقا بیدار بخت مرحوم کے مدرسہ السنہ شرقیہ میں شام کا داخلہ لے لیا جو دہلی دروازہ لاہور کے باہر تھا اور دو سال کی سخت محنت کے بعد جب کہ ساتھ ملازمت بھی کرتا تھا میں نے یہ امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا (۱۱)

قیام پاکستان کے دنوں میں الف۔ د۔ نسیم لاہور مقیم تھے اور سنٹرل ٹیلی گراف آفس میں ملازم تھے۔ ایک شام آفس سے گھر جاتے ہوئے انھوں نے لوگوں میں ایک عجیب قسم کی ہل چل محسوس ہوئی معلوم ہوا کہ سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے باہر کرپان لہرا کر مسلمانوں کو پنجاب سے بے دخل کر دینے کی بات کی ہے۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں ایک خاص قسم کی بے چارگی کی فضا پیدا ہوئی۔ فسادات پھیلے۔ اس دوران میں انھیں جامعہ پنجاب کی طرف سے ایک چٹھی ملی جس کے کہا گیا تھا

کہ آپ کے بی۔اے کے پرچے ملکی فسادات کی وجہ سے گم ہو گئے ہیں۔ آپ انگریزی کا امتحان دوبارہ دیں۔ تبسم صاحب نے مذکورہ پرچوں کا دوبارہ امتحان دیا اور نتیجہ آنے پر کامیاب قرار دیے گئے۔

قیام لاہور کے دنوں میں ٹیلی گراف آفس کے ایک فرننگ نامی اینگلو انڈین ملازم سے رسم و راہ تھی۔ تبسم صاحب نے اس سے کہہ کر اپنے برادر خورد کو ٹیلی گراف کے محکمے میں ملازمت دلوائی۔ ان کی بہن نے آس پاس کے گھروں کے کپڑے سینا شروع کر دیے۔ اس سے معاشی مسائل وقتی طور پر حل ہو گئے۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ایم۔اے اردو میں داخلوں کا اشتہار آیا۔ انھوں نے وہاں داخلہ لے لیا۔ یہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے اردو کی پہلی کلاس تھی۔ اورینٹل کالج میں انھیں اردو زبان و ادب کے عظیم اساتذہ سے کسب فیض کا موقع ملا۔ ایم۔اے اردو کے امتحان کے لیے تبسم صاحب نے "خواجہ میر درد: حیات اور فن" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ اس مقالے کے نگران کار ڈاکٹر سید عبداللہ تھے جب کہ بیرونی ممتحن سید ہاشمی فرید آبادی تھے۔ تبسم صاحب کو سو میں سے پچانوے نمبر ملے۔ وہ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن میں کامیاب ہوئے اور طلائی تمغے کے حق دار ٹھہرے۔ "تبسم صاحب کی شرافت اور نجابت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر اپنے طلائی تمغے کی زکوۃ دیتے رہے۔"(۱۲)

دوران تعلیم ان کے ہم جماعتوں میں پروفیسر مرزا منور اور قیوم نظر بھی شامل تھے لیکن تبسم صاحب کو ان پر فوقیت رہی۔ پروفیسر صابر لودھی اس حوالے سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے اُردو کی کلاسز کا اجرا ہوا تو قیوم نظر، مرزا محمد منور، امجد الطاف جیسے معروف شاعروں اور ادیبوں کے مقابلے میں انجانوں کے معروف قبیلے کے نکے زئی کے دو افراد الف۔د۔ تبسم اور ملک بشیر الرحمٰن نے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے کیا۔ تبسم صاحب نے مقالہ لکھا اس لیے انھوں نے پہلی پوزیشن حاصل کی اور ملک بشیر الرحمٰن نے دوسری۔ الف۔د۔ تبسم کو اپنی محنت پر ناز تھا اور ملک صاحب کو اپنی ذہانت کا زعم"(۱۳)

الف۔د۔ تبسم کو تقسیم کے بعد پاکستان بھر میں اردو کا پہلا گولڈ میڈلسٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی کامیابی کی بدولت انھیں جامعہ پنجاب میں دو سو روپے ماہوار پر اردو کے ریسرچ سکالر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ انھوں نے "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی

اردو کا مقالہ لکھا جس میں انھوں نے قدیم دکنی دور سے جدید زمانے تک متعلقہ موضوع کا احاطہ کیا تھا۔ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی کاپیاں برغرض مطالعہ ہندوستان میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور مولانا عبدالماجد دریابادی اور مشرقی پاکستان میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کو بھیجی گئیں۔ اپنی ڈاکٹریٹ کے مقالے میں نسیم صاحب نے بڑی دقت نظری کے ساتھ اپنے موضوع کا مفصل جائزہ لیا تھا۔ جب ان کے مقالے کی چار جلدیں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے پاس پہنچیں تو بے اختیار ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:

"جس نے یہ مقالہ لکھا ہے، مجھے یقین ہے اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی"(۱۳)

سید عبداللہ جیسی علمی طور پر قد آور شخصیت کی طرف سے یہ دراصل الف۔ د۔ نسیم کی محنت کا اعتراف تھا۔ اس حوصلہ افزائی پر ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم صاحب تاحیات نازاں رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے علاوہ بھی ان کے اساتذہ میں اس وقت کے بہت سے اہم نام تھے۔ تاریخ زبان وادب کا پرچہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی پڑھایا کرتے تھے۔ ناول اور افسانے کی تدریس سید وقار عظیم کے ذمے تھی۔ اقبالیات کے پرچے کی ذمہ داری باقاعدہ طور پر تو سید عبداللہ کے ذمے تھی لیکن علامہ اقبال کے دوست اور رسالہ "مخزن" کے مدیر سر شیخ عبدالقادر اکثر اعزازی طور پر تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کی پیرانہ سالی کے مسائل کے باعث اقبالیات کی کلاس او کالج ہال سے ملحق ایک کمرے میں ہوتی تھی۔ نسیم صاحب کو سر عبدالقادر کا لیکچر بہت پسند تھا کیوں کہ اس میں وہ علامہ اقبال کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد جیسے مشاہیر سے اپنی ملاقاتوں کا احوال سنایا کرتے تھے۔ طلبہ ان کی گفتگو کو تبرک سمجھ کر سنتے اور قیمتی موتیوں کی طرح اپنے دامن میں سمیٹتے جاتے۔ معروف حکیم مسیح الزماں عبدالمجید دہلوی کے صاحب زادے خواجہ محمد شفیع دہلوی لکھنوی اور دہلوی اسالیب کے اسرار و رموز سمجھایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نقد ونظر کے مواج سمندر کے شناور تھے۔ معروف ایرانی عالم علامہ عباس شوشتری فارسی کے مدرس تھے۔ نسیم صاحب قند فارسی کی شیرینی سے مزید بہرہ مند ہونے کے لیے ذاتی طور پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں متعین فارسی کے عظیم استاد علم الدین سالک کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان اساتذہ کی علمی صحبتوں کے باعث نسیم صاحب کے علمی آفاق وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ انھیں ادبی مجالس کے انعقاد کا تجربہ بھی ہوا جو دوران تدریس ان کے کام آیا۔ اس بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اورینٹل کالج میں دو سال ایم اے کے اور پھر یونیورسٹی لائبریری میں دو سال
ریسرچ سکالری کے میری آئندہ کی تدریسی اور تحریری زندگی کے لیے اکسیر
کا کام کر گئے۔ میں اپنے ان جملہ اساتذہ کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اس عرصے
میں مجھے پنجاب یونیورسٹی کی پہلی انجمن اردو اور انجمن عربی و فارسی کا الگ الگ
طالب علم سیکریٹری بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس وقت انجمن اردو کے صدر
جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان اور سیکرٹری ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔"(۱۵)

الف۔ د۔ نسیم کے اساتذہ بھی ان کی ذہنی صلاحیتوں کے معترف تھے:

"ریسرچ سکالری کے زمانے میں جب انجمن عربی و فارسی کا پہلا اجلاس ہوا تو
ریسرچ پیپر پڑھنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ اس مجلس میں جہاں عربی، فارسی اور
اردو کے شعبہ جات کے صدور اور اساتذہ موجود تھے۔ میں نے اپنا مقالہ لرزتے
ہوئے ہاتھوں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان کا اردو کی ترویج
میں حصہ کے عنوان سے پڑھا۔ پروفیسر علاؤ الدین صدیقی (صدر شعبہ
اسلامیات) تو اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسی وقت یہ مقالہ مجھ سے لے لیا
اور کہا کہ نقل کروا کر واپس کر دوں گا۔ یہ مقالہ بعد میں رسالہ اردو (انجمن ترقی
اردو کراچی) کے ایک شمارے میں شائع ہوا"(۱۶)

ان دنوں لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ ارباب ذوق کا شہرہ تھا۔ حلقے کے روح رواں قیوم نظر ان کے ایم اے اردو کے ہم جماعت تھے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے دونوں سے الگ بزم ادب کے نام سے ایک ادبی تنظیم بنائی، پروفیسر شہرت بخاری ان کے معاون بنے۔ نسیم صاحب کئی سال تک بزم ادب کے ہفتہ وار اجلاس منعقد کرتے رہے۔ اپنی آپ بیتی میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

میرے علم و ادب کے شوق نے مجھ سے یہ کام لیا کہ میں نے بزم ادب کے نام
سے ایک بزم بھی قائم کر لی جس کا اجلاس ہر ہفتہ کی شام سنٹرل ٹیلی گراف آفس
سے ملحقہ ایک کمرہ میں ہوا کرتا تھا۔ یہ اس لیے کہ میں یہاں ملازم تھا۔ اس میں
ہندو اور مسلمان شعرا و ادبا معقول تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ شہرت بخاری

> صاحب جو ابتدائے جوانی میں اس بزم میں آیا کرتے تھے انھیں شاید یاد ہو کہ
> اس بزم کے اہم شرکا کون کون تھے۔ میرے ذہن سے تو ان کے نقوش مٹ چکے
> ہیں۔ میں نے یہ بزم کئی سال چلائی ادھر قیوم نظر حلقہ ارباب ذوق چلاتے
> تھے۔ اس کے اجلاسوں کی خبریں بھی چھپتی تھیں، چرچے بھی ہوتے تھے۔ اس
> درویش نے اپنی مٹی ہوئی طبع اور منکسر المزاجی کی وجہ سے نہ کبھی اس کا چرچا کیا
> اور نہ کبھی خبر چھپوائی۔ نہ کبھی اس کو پشت پناہ بنا کر کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش
> کی۔(۱۷)

لاہور میں قیام کا یہ عرصہ الف۔ د۔ نسیم صاحب کی زندگی کے لیے نہایت اہم ثابت ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے اپنا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ بورڈ کو جمع کروایا اور ۱۹۵۹ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے مستحق ٹھہرے۔ اس دوران میں وہ اردو زبان و ادب کے لیکچرر منتخب ہو کر لاہور سے ساہیوال آ گئے اور گورنمنٹ کالج منٹگمری (اب ساہیوال) میں متعین ہوئے۔

ہجرت کا تجربہ

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے لیے پاکستان کا قیام ایک روحانی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ایک خالص مذہبی گھرانے میں پرورش پائی تھی، مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا قیام ان کے مذہبی تصورات کا آئینہ دار تھا اور ان کے نزدیک ایک قلبی واردات سے کم نہ تھا۔ پاکستان بنا تو نسیم صاحب لاہور میں چھوٹی موٹی ملازمتیں کر رہے تھے۔ ان دنوں پاک و ہند کی سیاسی فضا خاصی مکدر تھی۔ سیاسی ہنگامہ آرائی عروج پر تھی۔ نسیم صاحب ان دنوں منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ ان دنوں ایک واقعے نے ان کو حالات کی شدت کا احساس دلایا۔ کہتے ہیں:

> "منشی فاضل کرنے کے بعد میں بی اے انگریزی کا تیسرا اور آخری پرچہ دے کر
> موری دروازہ لاہور کی ایک عمارت ایس پی ایس کے ہال سے نکلا تو دیکھا کہ
> لوگوں کا ایک ہجوم اس طرف اور ایک اس طرف جا رہا ہے۔ بھاگم بھاگ قسم
> کا عالم تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب
> اسمبلی میں تلوار لہرا کر کہا ہے کہ ہم مسلمانوں کو نہ صرف مشرقی پنجاب بلکہ مغربی

پنجاب سے بھی نکال باہر کریں گے۔اس اشتعال انگیزی پر شہر میں ہندو مسلم
فساد ہو گیا ہے، دکانیں بند ہو چکی تھیں۔"(۱۸)

ہنگاموں کا آغاز ہوا۔گھر کے واحد کفیل ہونے کی وجہ سے پورے خاندان کی بہ حفاظت مشرقی پنجاب سے نقل مکانی ان کی ذمہ داری تھی۔ انھوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھائی تو لیکن مہاجرت کے اس کرب آمیز عمل میں ان کے حصے میں بھی بے سروسامانی آئی۔ان تلخ دنوں کی یادوں کا ذکر کچھ اس انداز میں ہوتا ہے:

> "قیام پاکستان کے فوری بعد جب میں اپنے ایک چھوٹے بھائی، دو چھوٹی بہنوں اور والدہ کے ساتھ (میرے والد پاکستان بننے سے دو مہینے پہلے فوت ہو گئے تھے) آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرتا ہوا ہوشیار پور سے لاہور آیا تو عجیب قسم کی ذہنی، مالی اور معاشرتی حالت تھی۔ والد سر پر نہیں تھے۔ میں ۲۶۔۲۷ سال کی عمر میں تھا۔ گھر کے باقی افراد میرے ذمہ تھے۔ ایک اور عجیب بات یہ تھی کہ ہوشیار پور سے ہم سوئی تک ساتھ نہ لا سکے تھے اور یہاں آ کر بھی سوئی تک نہ تھی۔ اس میں میری کم عمری، دنیاوی لحاظ سے ناتجربہ کاری اور درویش منشی کو دخل تھا۔"(۱۹)

مفلوک الحالی کے اس ماحول اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے کراہتے ہوئے اس عرصہ میں کچھ عزیزوں کی لاشوں کی اطلاعات بھی ملتی رہیں۔ان میں سے بعض کے تجہیز و تکفین کی سعادت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ان کی بیوی کے چچا (جو خود کانگریسی تھے) اپنے محلے کے ایک کانگریسی لیڈر رلبیر سنگھ کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

شادی اور اولاد

الف۔د۔نسیم صاحب کی ان کے رشتے داروں میں محترمہ ثریا بیگم سے نسبت پاکستان کی تشکیل کے کچھ عرصہ پہلے ہوشیار پور میں قیام کے دنوں میں ہی طے ہو چکی تھی۔ثریا بیگم صاحبہ کا تعلق ایک باعزت اور ممتاز گھرانے سے تھا۔منگنی ہو چکی تھی اور شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔بدقسمتی سے والد گرامی شیخ شیر محمد کی وفات اور ۱۹۴۷ء کے فسادات کے باعث شادی تاخیر کا شکار ہو گئی۔لاہور میں

قیام کے دنوں میں انھوں نے نہایت سادگی سے نکاح کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی ان کی شادی کی روداد سنیے:

> "ہم نے سات روپے ماہوار پر ایک مسلمان کا چوبارہ سعدی پارک مزنگ لاہور میں لیا اور رہائش پذیر ہو گئے۔ میری منگنی چوں کہ پہلے ہو چکی تھی۔ فسادات کی وجہ سے شادی بھی نہ ہو سکی تھی اور میرے سسرال والوں کا گھر مع معقول جہیز کے جو مجھے ملنے والا تھا نذر آتش کر دیا گیا۔ میرے سسرال والے اس محلے میں آ گئے جہاں میں مقیم تھا۔ حالات کی بے یقینی کے باعث میری والدہ نے اصرار کیا کہ نکاح کا وقت دے دیا جائے۔ ان کے پاس بھی کچھ نہ تھا۔ وہ مجبور تھے۔ میں، میرا بھائی اور ایک اور چھوٹا لڑکا سعدی پارک کی مسجد میں گئے اور میرا نکاح ہو گیا۔ یہ مثالی شادی جس میں تین باراتی تھے کوئی جہیز سونا چاندی، برتن، فرنیچر نہ تھا۔" (۲۰)

محترمہ ثریا بیگم ایک انتہائی وفا شعار اور سلیقہ مند اہلیہ ثابت ہوئیں، وہ شریعت کی پابند خاتون تھیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی قیام گاہ ساہیوال میں حالی روڈ پر واقع تھی۔ دونوں میاں بیوی نے تمام عمر اکٹھے بسر کی۔ راقم کا مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تمام نرینہ اولاد روزگار کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم تھی۔ نسیم صاحب کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ محترمہ ثریا بیگم اپنے خاوند کی خوب دیکھ بھال کرتیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خوش لباسی اور صحت مندی اماں جان (محترمہ ثریا بیگم کو سب اماں جان پکارتے تھے) کے مرہون منت تھی۔ علی رضا احمد کے مطابق:

> "ڈاکٹر صاحب کا پانچ مرلے پر مشتمل سنگل سٹوری کرائے کا گھر جو کہ گول چکر مسجد کے نزدیک تھا اس میں صرف دو افراد ہی رہتے تھے، یہ گھر ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے سعودی عرب میں مقیم بیٹے شاہد طیب نسیم نے خرید لیا تھا۔ وہاں پر ان کی نہایت ہی وفا شعار بیوی شام کے وقت وہاں پر بیٹھے بھی لوگ موجود ہوتے ان کے لیے چائے کا انتظام کرتیں۔" (۲۱)

شوہر کی وفات کے بعد اپنے فرزند طاہر نسیم کے گھر اسلام آباد مقیم ہو گئیں۔ وہیں انتقال ہوا، تدفین لاہور میں ہوئی اور اپنے شوہر کے پہلو میں قبرستان میانی صاحب میں دفن ہو گئیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔

قیام کے دنوں میں انھوں نے نہایت سادگی سے نکاح کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی ان کی شادی کی روداد سنیے:

"ہم نے سات روپے ماہوار پر ایک مسلمان کا چوبارہ سعدی پارک مزنگ لاہور میں لیا اور رہائش پذیر ہو گئے۔ میری منگنی چوں کہ پہلے ہو چکی تھی۔ فسادات کی وجہ سے شادی بھی نہ ہو سکی تھی اور میرے سسرال والوں کا گھر مع معقول جہیز کے جو مجھے ملنے والا تھا نذر آتش کر دیا گیا۔ میرے سسرال والے اس محلے میں آ گئے جہاں میں مقیم تھا۔ حالات کی بے یقینی کے باعث میری والدہ نے اصرار کیا کہ نکاح کا وقت دے دیا جائے۔ ان کے پاس بھی کچھ نہ تھا۔ وہ مجبور تھے۔ میں، میرا بھائی اور ایک اور چھوٹا لڑکا سعدی پارک کی مسجد میں گئے اور میرا نکاح ہو گیا۔ یہ مثالی شادی جس میں تین باراتی تھے کوئی جہیز سونا چاندی، برتن، فرنیچر نہ تھا۔" (۲۰)

محترمہ ثریا بیگم ایک انتہائی وفا شعار اور سلیقہ مند اہلیہ ثابت ہوئیں، وہ شریعت کی پابند خاتون تھیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی قیام گاہ ساہیوال میں حالی روڈ پر واقع تھی۔ دونوں میاں بیوی نے تمام عمر اکٹھے بسر کی۔ راقم کا مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تمام نرینہ اولاد روزگار کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم تھی۔ نسیم صاحب کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ محترمہ ثریا بیگم اپنے خاوند کی خوب دیکھ بھال کرتیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خوش لباسی اور صحت مندی اماں جان (محترمہ ثریا بیگم کو سب اماں جان پکارتے تھے) کے مرہون منت تھی۔ علی رضا احمد کے مطابق:

"ڈاکٹر صاحب کا پانچ مرلے پر مشتمل سنگل سٹوری کرائے کا گھر جو کہ گول چکر مسجد کے نزدیک تھا اس میں صرف دو افراد ہی رہتے تھے، یہ گھر ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے سعودی عرب میں مقیم بیٹے شاہد طیب نسیم نے خرید لیا تھا۔ وہاں پر ان کی نہایت ہی وفا شعار بیوی شام کے وقت وہاں پر جتنے بھی لوگ موجود ہوتے ان کے لیے چائے کا انتظام کرتیں۔" (۲۱)

شوہر کے وفات کے بعد اپنے فرزند طاہر نسیم کے گھر اسلام آباد مقیم ہو گئیں۔ وہیں انتقال ہوا، تدفین لاہور میں ہوئی اور اپنے شوہر کے پہلو میں قبرستان میانی صاحب میں دفن ہو گئیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔

۔ نسیم اور ان کی اہلیہ کی زندگی سادگی اور قناعت پسندی کے لحاظ سے حضرت خواجہ حمید الدین ناگوری رحمتہ اللہ علیہ اور ان کی اہلیہ محترمہ کی حیات مبارکہ کی مثل تھی۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی اولاد بھی انھی کی طرح نیک نام اور خوش اطوار بنی۔ محترمہ ثریا بیگم کے بطن سے ہونے والی اولاد کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ ڈاکٹر سعادت سعید: معروف شاعر اور ادیب۔ ممتاز پروفیسر جی سی یونیورسٹی لاہور،

۲۔ حسن جاوید: (م ۲۰۰۱ء) سیاسیات کے استاد۔ وفات کے وقت ایف سی کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔

۳۔ طاہر نسیم: نجی کارپوریشن آئل اینڈ سیڈ وِنگ، اسلام آباد میں اہم عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

۴۔ طاہرہ بتول (زوجہ زاہد حسن)

۵۔ شاہد نسیم: سعودی فرانس بینک میں افسر، حال مقیم الریاض (سعودی عرب)

۶۔ طیبہ بتول (زوجہ اطہر نسیم)

والدین کا اپنے بچوں پر اعتماد اور ان سے گہرا پیار بھی نمایاں تھا۔ الف۔ د۔ نسیم نے رزق حلال سے اپنی اولاد کی پرورش کی۔ ان کی اولاد والدین کا بہت احترام کرتی تھی۔ ہمہ خانہ آفتاب است کے مصداق ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی اولاد نے عملی زندگی میں والد گرامی کا خوب روشن کیا لیکن ان کے علمی و ادبی وارث ان کے سعادت مند صاحب زادے، اسم با مسمیٰ ڈاکٹر سعادت سعید ہے۔

حلیہ اور وضع و لباس

الف۔ د۔ نسیم مرحوم ایک بارعب اور خوب صورت انسان تھے۔ مرزا غالب کی چمپئی رنگت والی مثال ان پر صادق آتی تھی۔ انتہائی مدلل اور مفصل گفتگو کرتے۔ ان کی گفتگو کا محور اسلام، آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی، اہل بیت رسولؐ، علامہ محمد اقبالؒ، پاکستان اور اردو تھا۔ ان موضوعات پر بات کرتے ہوئے اکثر آب دیدہ ہو جاتے۔ شام کی ایک مجلس جو راقم کی یادداشت کا حصہ ہے، وہ اپنے گھر کے مہمان خانے میں تشریف فرما تھے، ایک معروف نعت خوان حضرت امیر خسروؒ کی غزل ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ جب وہ "ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف" والے شعر پر پہنچے تو نسیم صاحب پر رقت طاری ہو گئی، آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی رواں تھی ہچکی بندھ گئی، سرخ و سفید رنگت اس کیفیت

میں اور بھی دمک اٹھی۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک سچے مسلمان تھے، انھوں نے کبھی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا، ولائتیں نہیں ہوئیں، عمر کا زیادہ حصہ کرائے کے مکان میں گزارا، مال و دولت سے انھیں کوئی رغبت نہیں تھی، اس قلندرانہ بے نیازی نے ان کے حسن و جمال میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا حلیہ ان کے نبیرہ مسعود علی رضا احمد یوں بیان کرتے ہیں:

"میرے دادا کے پاس ایک نجابت وجیہہ، خوب صورت، دراز قد، گورا چٹا، سرخ گالوں والا اور نجابت جاذب نظر اور کشش رکھنے والا اور درویش صفت شخص اکثر سفید کپڑوں میں، صاف ستھرے جوتے پہنے آیا کرتا تھا۔ باقاعدگی سے کلائی پر گھڑی اور سر پر سفید ٹوپی ہوتی۔ دونوں بزرگ اکٹھے تشریف فرما ہوتے۔ وہ آپس میں اکثر علمی باتیں کیا کرتے تھے جو کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہوتیں" (۴۴)

پروفیسر صابر لودھی ایمرسن کالج کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر ملک بشیر الرحمٰن کی وساطت سے گورنمنٹ کالج ساہیوال پہنچے، ڈاکٹر الف د نسیم ان دنوں جلتے میں اردو کی چالیس کلاسیں پڑھایا کرتے تھے، ان کی سفارش پر پرنسپل میاں اصغر علی نے انھیں اردو کا لیکچرر منتخب کر لیا، انھیں عرصے تک نسیم صاحب کے رفیق کار کی حیثیت سے کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے وضع قطع اور عادات و اطوار کے بارے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر الف د نسیم کو اپنے نام کے سوا کوئی کمپلیکس نہیں۔ انگریزی لباس کے سوا انھیں انگریزوں کی کوئی ادا پسند نہیں۔ والدین نے ان کا نام خالص اسلامی اور مقامی رکھا، اللہ دتا۔ لیکن انھوں نے اسے الف۔ د میں بدل دیا۔ اللہ دتا میں جو عقیدت اور مقامیت ہے وہ الف۔ د میں نہیں۔ انگریزی زبان کے تسلط کے خلاف انھوں نے جتنا کام کیا، اتنا کام کوئی ایک ادارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کالج میں وہ ہمیشہ سوٹ اور نکٹائی کے ساتھ ہی آتے۔ سردیوں میں گرم کپڑے کا اور گرمیوں میں ٹسر کا سوٹ زیب تن رکھتے۔ (میں انھیں گذشتہ کئی برس سے نہیں ملا۔ ممکن ہے اردو زبان کے حق میں تحریک چلاتے ہوئے انھوں نے مغربی لباس کو بھی خیرباد کہہ دیا ہو"۔ (۴۳)

اسی بارے میں وہ مزید رقم طراز ہیں:

> ڈاکٹر الف د نسیم بڑے صابر و شاکر انسان تھے۔ اضطراب نام کو بھی نہیں۔ چند اچھی کتابوں کی طرح انھوں نے چند ہی دوستوں سے تعلقات استوار کیے ہیں۔ وہ ہر اک رہرو کے ساتھ تھوڑی دور جانے میں بھی محسوس کرتے ہیں۔ "آکو الف مجنوں در کوہ..." ان کا سوتر ہے۔ ساہیوال میں ایک آدھ بستی سے ایسا پیمان لگایا کہ جب انھیں گورنمنٹ کالج لاہور میں آنے کے لیے پوچھا گیا پر ساہیوال انھیں دلی کی طرح عزیز ہے۔ ساہیوال کے سکوت میں درویش صفت لوگوں کے لیے بڑی کشش ہے۔ ڈاکٹر نسیم لاہور چھوڑ کر دیتیں کے ہو رہے اور مجید امجد نے جھنگ جیسے مردم خیز خطے پر ساہیوال کو ترجیح دی۔ (۲۴)

پروفیسر سید محمد اکبر قادری زبان و ادب کے جید استاد ہیں، وہ کالج میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ہم راہ درس و تدریس میں مصروف رہے، انھوں نے ایک طویل مضمون میں ڈاکٹر نسیم کے حلیہ ولباس اور شخصیت کے بارے میں کہا ہے کہ:

> ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ایک خوب صورت طلسماتی شخصیت تھے، وہ شعبہ اردو کے انجانی قرش شناس سربراہ اور صاحب ادراک صوفی تھے، اکثر موسم گرما میں بھی مع نکٹائی کوٹ پتلون زیب تن کیے جب کالج کی حدود میں داخل ہوتے تو پا دنسیم کے معطر جھونکوں سے فضا مہک اٹھتی تھی، تصوف ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع تھا۔ مجاز و حقیقت کے امتزاج سے صاف اور سادہ لیکن حکیمانہ پیرایہ اظہار سے انسانی، نفسانی، نفسیاتی وجدانی معاملات و کیفیات کو پر معنی اور دل چسپ حکایات کے ذریعے بیان کر کے محفل کو گرمائے رکھتے تھے(۲۵)

پروفیسر ڈاکٹر منصور قریشی کا شمار ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم مرحوم کے عزیز شاگردوں میں ہوتا ہے، اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب کا رنگ سرخ و سفید، قد میانہ ترکش کے تیر کی طرح سیدھا، بدن دہرا، آنکھیں کچھ سوچتی ہوئی، کچھ بولتی ہوئی، ہر لحظہ متحرک، پیشانی کشادہ لیکن جھریوں کی طبع آزمائی سے خالی، لبوں پہ ہر وقت ایک مخصوص مسکراہٹ

سرگرداں اور رقصاں، زیر دست مجتہد، مجسمۂ بے نیازی، بیدار مغز، حسن چہرے میں ہو یا آواز میں ڈاکٹر صاحب اس کی دل پذیری پر جی جان سے فدا ہو جاتے، اپنے عہد کے کلاسیک کے ساتھ جڑے ہوئے علائق سے بے نیاز، وضع دار انسان تھے(۲۶)

علمی، ادبی اور شعری سفر

ڈاکٹر ایف۔ ڈی۔ نسیم کی علمی و ادبی کائنات کا اکھوا تو ہوشیار پور ہی میں پھوٹا تھا، جہاں نسیم صاحب کے استاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی صحبت نے انھیں شعر وسخن کی طرف متوجہ کیا۔ غلام جیلانی برق نے انھیں مشورہ دیا کہ شاعری کی ابتدا موجودہ عہد کے معروف شعری نمونوں کی تحریف سے کی جائے۔ استاد گرامی کے حکم کی تعمیل میں نوجوان نسیم نے شاعری کا آغاز کیا۔ کالج کے ان سنہرے دنوں میں اس انداز کی مزاحیہ شاعری طلبہ میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ شاعری ان کے شعری سفر کی ابتدائی نشانی ہے:

ان رقیبوں نے مجھے اتنا ستا رکھا ہے
مجھ سے محبوب کو باغی سا بنا رکھا ہے
بات کی دل کی تو بولا کہ بد تمیز عاشق
تیرا دل میں نے تو جوتے میں چھپا رکھا ہے (۲۷)

جو نہیں ہے مبتلائے درد دل
یارب اس کو پچھاڑ کھائے درد دل
سنتے ہیں کہ تلی پھرا کرتی ہے یوں
ایک منکے میں دبائے درد دل (۲۸)

ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والے مصاحبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ان کا رجحان شاعری کی بجائے نثر کی طرف تھا۔ حسن رضوی سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنے ادبی کیریئر کا آغاز تو میں نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں دو تین ناول لکھے تھے ایک کا نام منورما کی کہانی تھا اس میں ایک

مجبور ہندو عورت کی چتا قلم بند کی تھی۔ دوسرا تاریخی ناول تھا جس میں قلعہ چتوڑ کی
فتح اور اس کے تاریخی و تہذیبی اثرات کی نشاندہی کی تھی۔(۲۹)

اس کے برعکس اپنی خود نوشت میں انھوں نے ادبی سفر کی ابتدا میں شعر گوئی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس عہد میں کہی جانے والی شاعری کے نمونے بھی درج کیے ہیں۔ قیاس ہے کہ شاعری کو ابتدا میں انھوں نے محض تفریحِ طبع کے طور پر لیا ہوگا۔ اس کے برعکس نثر کی سنجیدگی نے ان کو اپنی جانب متوجہ کیا ہوگا یوں وفات کے زمانے تک نظم اور نثر دونوں سے ان کا علاقہ رہا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی صورت میں اردو ادب کو ایک باکمال شاعر اور اعلیٰ محقق و نقاد میسر آ گیا۔

انسانی فکر مختلف ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے، ناول نگاری سے شوق شاعری کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس عہد میں نسیم صاحب کو ہوشیار پور میں فارسی کے عظیم شاعر مولانا غلام قادر گرامی سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ مولانا گرامی کی شخصیت کا رعب و جلال ان سے کھل کر بات چیت کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنا رہا۔ منٹگمری (ساہیوال) میں مقیم مولانا غلام قادر گرامی کے شاگرد مولانا عزیز الدین احمد عطائی نے اس کمی کو پورا کیا۔ عطائی اپنی وضع کے مختلف آدمی تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے جہاں انھیں مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ، مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے بقول وہ نحیف الجثہ ہونے کے باوجود پہلوانی کا شوق رکھتے تھے۔ انھوں نے رستم زماں گاماں پہلوان کی شان میں فارسی قصیدہ بھی کہہ رکھا تھا(۳۰)۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ساہیوال میں طویل قیام کے دنوں میں مولانا عطائی سے شعر گوئی میں باقاعدہ اصلاح لی۔ مولانا سے پہلی ملاقات اس کی روداد انھوں نے تفصیل سے بیان کی ہے، ایک طویل اقتباس دیکھیے:

> پہلی بار مولانا عطائی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ غالباً ۵۵ء کی گرمیوں کی ایک شام کا ذکر ہے۔ میں اپنی اداس سی طبیعت کو فریب دینے کے لیے گھر سے ٹہلنے کی غرض سے نکلا۔ تفکر میں ڈوبے ہوئے ایک درخت کے نیچے دو نحیف شخص کھڑے تھے ان میں سے ایک گورنمنٹ سکول کے مدرس شیخ نیاز محمد صاحب تھے جو میرے عزیز بھی ہیں اور مہربان بھی۔ میرے دیکھتے ہی انھوں نے بلا لیا اور دوسرے صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے "ان سے ملیے یہ

> مولانا عظامی ہیں آپ تو جانتے ہی ہوں گے گرامی صاحب کے شاگرد ہیں"۔ یہ آشنا نام سن کر میں کچھ چونک سا گیا۔ نظر کا رخ پھیر کر دیکھا تو ایک دبلا اور کمزور شخص نظر پڑا۔ اکہرے جسم کے اس انسان کو دیکھ کر مجھے ایک لمحہ کے لیے یقین نہ آیا کہ یہ عظامی صاحب ہیں اس لیے گرامی کی نسبت سے عظامی کا تصور میرے ذہن میں موجود تھا وہ ایک فربہ بدن انسان کا تھا مولانا گرامی کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا وہ میرے شہر اور محلے کے رہنے والے تھے۔ جس زمانے میں میں نے انھیں دیکھا تھا وہ عمر کے آخری سالوں میں تھے۔ بھرا ہوا جسم اور پر رعب چہرہ رکھتے تھے آواز میں گھن گرج تھی جس کی گونج ان کے مکان کے سامنے کے گلی میں کھیلتے ہوئے اکثر میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ سر پر بڑا سا عمامہ باندھتے تھے۔ جس سے ان کی شخصیت اور بھاری بھرکم معلوم ہوتی تھی میں نے ذہن میں مولانا عظامی کو بھی انھیں کی مثل خیال کر رکھا تھا۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ عظامی صاحب کو دیکھ کر میں نے یوں محسوس کیا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے نے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ابھی میں تاثر کے اس جہان میں تھا کہ میرے کانوں میں آواز آئی "محترم خیریت ہے" اور ساتھ ہی ایک کمزور ہاتھ میری طرف بڑھا۔ میں نے شکریہ کہ کر مصافحہ کیا اور تیزی سے انھیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ان کو اس طرح دیکھتے ہی میرے جذبات میں اس قسم کا ارتعاش پیدا ہوا جس کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں مجھے وہ تبرک معلوم ہوئے جو دیکھنے میں تو قلیل ہوتا ہے لیکن قیمت میں انمول۔ میں نے عرض کی، پیر و مرشد فقیر تو آپ کے قدیم نیاز مندوں میں سے ہے اور ایک عرصہ سے زیارت کی خواہش تھی۔(۳۱)

مولانا عزیز الدین احمد عظامی نے اولین ملاقات میں تبسم صاحب کو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا عظامی گذشتہ عہد کی شرافت کا نمونہ تھے، صاحب واردات تھے، انھوں نے تبسم صاحب کی دلی خواہش جان لی تھی۔ اہل سلوک کا مشورہ دینے کا انداز مختلف ہوتا ہے:

گفتیم در پی اہل نظر یک اشارت است
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

اب اردو کے ساتھ ساتھ فارسی گوئی کا آغاز بھی ہوا لیکن مزاج کے شرمیلے پن کی وجہ سے پہلی دفعہ براہ راست غزل لے کر پہنچنے کی بجائے انھوں نے مولانا کے صاحب زادے کا وسیلہ استعمال کیا جو کالج میں ڈاکٹر صاحب کے شاگرد تھے:

> غزل کہنے کو تو کہہ لی لیکن فارسی کی مشق نہ ہونے کی بنا پر اس کے بعض مقامات کی صحت اور تسلی بخش معیار کے متعلق مجھے شک رہا۔ طبیعت کی خوئی اور کلام کی بے اعتباری کا احساس کی وجہ سے مجھے خود تو علائی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرات نہ ہوئی۔ البتہ میں نے ایک مکتوب کے ساتھ غزل ان کے بیٹے معز الدین صاحب فاضل کو دی جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے تاکہ وہ اپنے بزرگوار کو پہنچا دیں۔ (۳۲)

سر پر عثمانیوں کی عظمت رفتہ کی نشانی کے طور کالا والا لال رنگ، ڈھیلی آستین کا کرتا، شرعی شلوار، گردن اور کندھوں کے گرد لپٹا ململ کا پٹکا، پیروں میں سادہ سی جوتی۔ مولانا عزیز الدین احمد علائی ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم صاحب کو پہلی نظر میں صدیوں پرانی کسی مسجد کا مینار لگے تھے۔ ان کا شمار اس نوع کے بزرگوں میں ہوتا تھا جو کسی نہ کسی طرح قدیم وضع قطع کو قائم رکھتے ہیں۔ اس خصوصیت کو مرزا اسداللہ خان غالب نے "پاس وضع" کا نام دیا ہے۔ عقیدت کا یہ تعلق مولانا کی وفات تک قائم رہا۔

تدریسی زندگی

یہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا ایک خوش گوار دن تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم صاحب اردو زبان و ادب کے ایک استاد کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج ساہیوال (تب منٹگمری) میں تعینات ہوئے۔ ساہیوال ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر تھا۔ ان دنوں یہ ضلعی ہیڈ کوارٹر تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کالج میں اردو زبان و ادب کے واحد استاد کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ ان کی ملازمت کے اختتام تک جاری رہا۔ اس دوران میں دیگر تعلیمی اداروں میں جانے کے مواقع بھی ملے لیکن انھوں نے گورنمنٹ کالج ساہیوال کو ترجیح دی۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میرے بیے پرنسپل بن کر باہر جانے کے کئی مواقع آئے لیکن میں نے
> اسے اس لیے قبول نہ کیا کہ دفتری منتظم بن کر بچوں کو اس نور اور دانش کی
> نعمت سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا جو میں مدرس اور معلم کی حیثیت سے ان
> کو کلاس روم اور اس کے باہر عطا کر سکتا تھا۔ میرے لیے لاہور جانے
> اور وہاں کی مرکزیت میں رہ کر کئی قسم کے فائدے اٹھا سکنے کی نوبتیں بھی
> آئیں لیکن نہ جانے اس گورنمنٹ کالج ساہیوال میں کیا کشش تھی کہ میں
> نے یہیں رہنے کو ترجیح دی''(۳۳)

ڈاکٹر تبسم کی گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بے پایاں محبت کے متعدد اسباب ہیں۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال ایک تاریخی ادارہ ہے،اس کا قیام ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج منٹگمری کے نام سے عمل میں آیا،۱۹۳۵ء میں یہ اس عمارت میں منتقل ہوا جہاں آج کل گورنمنٹ کالج آف کامرس ساہیوال ہے۔۱۹۵۱ء میں یہ اپنی موجودہ عمارت میں منتقل ہوا جو کیڈٹ کالج کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔دو تین سال تک اس کے ایک حصے میں کیڈٹ کالج کی تعلیمی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔اس عمارت کا نقشہ برٹش انڈیا کے زمانے میں بن چکا تھا۔۱۹۶۶ء میں یہ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے نام سے موسوم ہوا۔یہ سوا کلو پر مشتمل تعلیمی ادارہ ہے،اس کا سرگوشیاں کرتا ہوا کیمپس،مزین لائبریری،وسیع وعریض کھیلوں کے میدان،خوب صورت باغات،دیدہ زیب ہاسٹل اور کیفے ٹیریا کا منفرد ماحول اسے انفرادیت عطا کرتا ہے۔ پروفیسر سید محمد اکبر کے مطابق:

> کالج گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی ایک دلکش و فرحت بخش سیر گاہ کی نہایت منزہ
> و روح پرور فضا نے بسیط مجسم بہار کا نقشہ پیش کرتی جس کی آغوش عافیت میں
> دل و دماغ کو آسودگی اور حواس کو جلا ملتی تھی۔ پائیں باغ،نشیب باغ اور باغ
> گلاب انتظامیہ کی خوش ذوقی کے مظہر تھے۔(۳۴)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے جمال پرست مزاج پر کالج کا ماحول اثر انداز ہو گیا۔ بظاہر ان کے مستقل قیام کی یہی وجہ لگتی ہے۔ملازمت کے دنوں میں ان کے کالج کے رفقا کے ساتھ گہرے مراسم رہے۔نسیم صاحب کالج میں سٹاف کی قلت کے باعث زیادہ تر کلاسز خود لیتے تھے۔(کچھ عرصے بعد پروفیسر صابر لودھی ان کی کمک کے لیے پہنچ گئے)۔ یہ چھوٹا سا شہر ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے قلندرانہ

مزاج کے مطابق تھا۔شہر میں یہ بڑا کالج زیادہ تر علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔مختلف مضامین کی انجمنیں متحرک تھیں۔کالج میں کھیلوں کے میدان آباد تھے۔لائبریری میں پبلک سیکشن بھی تھا۔طلب کے علاوہ شہر سے علم و ادب کے رسیا بھی استفادہ کرتے۔ہر جمعرات کی رات بڑی سکرین پر فلم دکھائی جاتی۔ڈرامیٹک کلب اچھا خاصا فعال تھا۔اس فضا میں ہر کسی کو اس کے مزاج کی فضا میسر تھی۔رحیم صاحب نے اس ماحول میں اپنا منفرد اور الگ مقام بنایا۔پروفیسر صابر لودھی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

> کالج کے اس آزاد اور طلسماتی ماحول میں اساتذہ کے مختلف گروہ تھے۔ایک گروہ دختر رز کا دلدادہ تھا۔وہ رات کو عمر خیام کی رباعیاں پڑھتے۔مے و مینا سے یاریاں کرتے اور صبح تک مسرور رہتے۔اس گروہ کے افراد گفتگو کے فن میں طاق تھے۔ان کی محفل سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ایک صاحب اپنی ذات میں انجمن تھے۔چرس کا دم لگاتے اور ایک خوبصورت لیکچر برآمد کرتے۔وہ پروفیسر فوٹو گرافی میں فرد تھے۔دن بھر پھولوں اور تتلیوں کے حسن کو اپنے کیمروں میں محفوظ کرتے رہتے۔نوجوانوں کی ایک بڑی ٹولی کالی کی تلاش میں رہتی جس پروفیسر کے یہاں اچھی کالی ملتی وہاں جا ٹھکتے۔باقی جو بچ رہتے وہ ملک منصب کے صاف ستھرے قہوہ خانے میں بیٹھے چائے پیتے اور آملیٹ کھاتے۔ان لوگوں میں زیادہ تعداد کنواروں کی تھی۔ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی سلام دعا سبھی گروہوں کے افراد سے تھی لیکن ان کا بیٹھنا اٹھنا لائبریری کے ایک پرسکون گوشے میں تھا۔جہاں وہ زیادہ تر تصوف اور فلسفے کی کتابیں پڑھتے نظر آتے یا ان کے سامنے لغات کشوری، نور اللغات اور جامع اللغات کی جلدیں کھلی ہوتیں۔میں انھیں دیکھتا تو وہ کہتے۔"بھئی! لفظوں اور اصطلاحوں کا مطالعہ بھی عجب چیز ہے۔لغات ضرور دیکھا کرو۔" ان کے اس مطالعے کا حاصل وہ فلسفیانہ تحریریں ہیں جو اب زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں اور اپنی اقدار ظاہر کر رہی ہیں۔(۳۵)

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم تعلیم و تعلم سے متعلقہ امور کے علاوہ کالج کی کرکٹ ٹیم کے انچارج بھی رہے،

وہ کھیل کے میدان میں موجود رہتے، کھلاڑیوں کے انتخاب میں خصوصی دل چسپی لیتے۔ ان دنوں کا ایک واقعہ خاصا یادگار ہے:

> ڈاکٹر الف د نسیم کو مبداء فیض سے بڑی پاک اور حسن پسند نگاہ عطا ہوئی ہے۔ میاں اصغر علی (پرنسپل) میں بھی یہ خوبی موجود تھی۔ اس لیے دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی۔ داخلے کے دنوں میں خدا جانے خوب صورت چہروں کا داخلہ یقینی ہوتا تھا۔ کرکٹ کے ٹرائل کے موقع پر میاں اصغر علی اپنے ہمراہ نسیم صاحب کو ضرور لاتے۔ ایک بانکا اور دراز قامت لڑکا فیلڈنگ کر رہا تھا۔ میاں اصغر علی نے کہا: "اسے تو فوراً لے لو۔ گراؤنڈ میں کھڑا اچھا لگے گا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی اس انتخاب پر خوش ہوئے۔ (۳۶)

اکثر وہ کالج کی تقریبات میں بھی شریک ہوتے اور حسب احوال گفتگو فرماتے۔ پروفیسر میاں قاسم سلیم ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم وضع داری اور ویگر اعلیٰ روایات کے پیکر تھے۔ میری خوش قسمتی کہ طالب علمی کے چاروں سال میں ان کی کلاس میں رہا۔ پڑھاتے کیا تھے معلوم ہوتا تھا گھول کر پلا رہے ہیں۔ کیا زمانہ تھا کہ سارا سال ہر روز میں طلبہ سوسائٹیوں کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ کیا سائنس کیا آرٹس سبھی طلبہ تعلیم و تربیت کے خواہاں تھے اور اساتذہ بکمال اخلاص سے ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں منہمک۔ ایک روز شعبہ کیمیا نے ایک تقریب میں ڈاکٹر صاحب کو دعوت سخن دی۔ ڈاکٹر صاحب نے دو شعر ارشاد فرمائے جو حافظے میں نقش ہو گئے۔ کمال حافظہ کا نہیں برمحل اشعار کا ہے کہ پچاس سال کا طویل عرصہ گزرنے پر بھی بھلائے نہ جا سکے۔ (۳۷)

اس دور میں کتب و رسائل کے اشاعتی امور میں تکنیکی مسائل ہونے کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اس زمانے میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ادبی مجلے "ساہیوال" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ "ساہیوال" کے سال میں چار شمارے شائع ہوتے تھے۔ نسیم صاحب نے کالج میں "بزم اردو" کے نام سے ایک ادبی مجلس قائم کی۔ اس کے ہفتہ وار تنقیدی

اجلاسوں میں علمی و ادبی فن پارے پیش کیے جاتے۔ اجلاسوں میں ہونے والی گفتگو نئی نسل کی تربیت کا باعث بنتی۔ مختصر سے عرصے میں تازہ فکر نوجوانوں کی ایک کھیپ تیار ہوگئی۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ادبی مجلّہ "ساہیوال" کے طالب علم مدیران نے قومی سطح پر نام پیدا کیا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم مرحوم نے ادبی مجلے کی تحریروں کا معیار بلند رکھنے کی بھرپور مساعی کیں۔ یہ مجلہ علمی لحاظ سے اتنا معیاری تھا کہ مجلس ترقی ادب لاہور نے اس میں اقبالیات کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین کو "ادبی مجلہ ساہیوال میں اقبالیات" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

ملازمت کی ابتدا سے سبک دوشی تک (دو سال کے عرصے کے علاوہ) ان کا تمام وقت اسی تعلیمی ادارے میں گزرا۔ یہ دو سال انھوں نے گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں گزارے، جہاں ایم اے اردو کا آغاز ہوا تھا اور انھیں پی ایچ ڈی ہونے کی وجہ سے وہاں تبدیل کیا گیا۔ ملتان میں گزرے شب و روز کی کہانی ان کے رفیق کار پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کچھ یوں سناتے ہیں:

> میں ایمرسن کالج ملتان میں اردو زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے تعینات تھا۔ ایک دن جب میں کالج گیا تو میں نے ایک نہایت وجیہ اور خوب صورت شخصیت کو دیکھا۔ یہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم تھے۔ انھوں نے عمدہ پارس ذیب تن کر رکھا تھا۔ ان کا سرخ رنگ کا اکیڈمک گاؤن جو پی ایچ ڈی اساتذہ پہنتے تھے، ان کے حسن و جمال کو اور بھی دل فریب بنا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے، اپنا تعارف کروایا۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی دل نشیں لگے۔ انھوں نے بتایا کہ ایمرسن کالج میں ایم اے اردو کی کلاس شروع ہوئی ہے اور مجھے اس کا آغاز کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج منٹگمری (اب ساہیوال) سے تبدیل کر کے بھیجا گیا ہے۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر نسیم صاحب ہم نوگرفتار پرندوں کے ساتھ ہی ان کی قیام گاہ پر مقیم رہے۔ (۳۸)

جب بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں آ گیا تو ڈاکٹر صاحب اپنے شہر لوٹ آئے۔ ملازمت کے دوران میں انھیں مختلف تعلیمی اداروں میں کام کرنے کے بہترین مواقع میسر آئے لیکن نسیم صاحب نے ساہیوال کو ترجیح دی۔ یہاں سے ملازمت کی کامیاب تکمیل کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ صادق پبلک سکول بہاولپور میں بھی گزارا۔ ڈاکٹر نسیم محکمہ تعلیم حکومت پنجاب سے

طویل عرصہ وابستگی کے باوجود اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔تحکمانہ غفلت کی وجہ
سے اگلے گریڈ میں ان کی ترقی نہ ہوسکی،انھوں نے اپنے اس حق کے لیے محکمے کو متعدد خط لکھے لیکن
شنوائی نہ ہوئی۔ہمارے ہاں اہل کمال کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب حقیقی معنوں
میں ایک معلم تھے۔ایک معلم اگر اپنے طالب علم کو اپنے روحانی فیوض و برکات تک رسائی دے تو وہ
مرشد کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔اس کی تعلیم وتربیت کا دائرہ مسترشدین کی اخلاقی اصلاح اور روحانی
ارتقا تک پھیل جائے تو انقلاب برپا ہوسکتا ہے،ڈاکٹر الف۔د۔نسیم بنیادی طور پر ایک معلم استاد تھے
،وہ تمام عمر اپنے اس پیغمبرانہ پیشے پر فخر کرتے رہے۔معاشرے کو آکاس بیل کی طرح آہستہ آہستہ
برباد کرنے والی مادیت پرستی کے خلاف انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی۔مال ومنال کا حصول ان کا
مقصد نہ تھا،تمام عمر اپنی محدود سی آمدنی پر قانع رہے۔اپنے صوفیانہ مزاج کے باعث اس قلندری میں
بھی وہ امیر رہے،یہی ان کی زندگی کا ماحصل بھی تھا،ان کے ماہر تعلیم صاحب زادے جو اپنے
والد گرامی کے روز وشب کے معمولات کے گواہ ہیں اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتے ہیں:"ڈاکٹر الف۔د۔
نسیم شعبہ درس وتدریس سے اپنی وابستگی پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس شعبے کو طلبا
کی کردار سازی کا اہم ترین کام کرنا چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ وہ مادی و مالی منفعت کے حصول میں
مصروف اساتذہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔اقبال اور ارکان اسلام کے عنوان کے تحت
ایک خیال افروز کتاب لکھ کر انھوں نے اپنے اصلاحی اور منصبی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا کار خیر کیا
ہے۔انھیں معلوم تھا کہ عبارت آرائی میں گم ہونے والے فلسفی گفتار کے شہید تو ہوسکتے ہیں کردار کے غازی
نہیں بن سکتے۔ان کا خیال تھا کہ علم روح پرور ہو کر ہی اپنے فریضے سے سبکدوش ہوسکتا ہے۔اگر یہ جسم
محض کے تقاضوں کے لیے حاصل کیا جاتا ہے تو اس کی دنیاوی اہمیت کے باوجود کرداری مضرتوں کو نظر
انداز نہیں کیا جاسکتا"۔(۳۹)

استاد معاشرے کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے،وہ اپنے شاگردوں کے لیے بطور خاص
ایک رول ماڈل ہوتا ہے۔نسیم صاحب اخلاق اور کردار کے جس بلند مقام پر فائز تھے،اس کی مثال فی
زمانہ کم ملتی ہے۔انھوں نے تمام عمر انسانیت کے اعلیٰ اور ارفع اصولوں کا علم بلند رکھا۔واصف سجاد ان کی
شخصیت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب حقیقت میں صوفی اور قلندر تھے۔ زرا سوچیے جو پروفیسر صاحب

> اپنی ریٹائرمنٹ والے دن بھی ساری کلاسز پڑھا کر کالج کو سلیوٹ کر کے آئیں اور جو ساری عمر اپنے گولڈ میڈل کی زکوٰۃ دیتے رہے ہوں انھیں صوفی اور قلندر ہی کہیں گے۔ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی علم وعمل کی تصویر تھی۔(۴۰)

علی رضا احمد نے نسیم صاحب کی زندگی کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس سے ان کے رزقِ حلال کمانے کا فلسفہ واضح ہوتا ہے:

> اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے جی۔پی فنڈ کو سود سے پاک کرنے کی درخواست دے دی۔فرماتے تھے اس کے اگلے ہی سال انعام کے طور پر گئی عمرے اور حج کی سعادت نصیب ہو گئی جس کا بظاہر وسیلہ شاہد نسیم بنے۔(۴۱)

اخلاق و کردار کی اسی عظمت کے سبب شہر کے ادبی حلقوں نے ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔نسیم صاحب کے احباب کی مجلس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی پاکباز شخصیات شامل تھیں۔ان میں سید منظور احمد مجبور نقوی اور مجید امجد سرفہرست تھے۔اس علاوہ ان ہم راشد، سید صفدر علی شاہ، میر تسخیر، حلیم واحد حلیم وغیرہ بھی ان کی مجالس کا حصہ تھے۔نسیم صاحب کے صاحب زادے معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر سعادت سعید ان بڑوں کے بارے میں کہتے ہیں:

> سید منظور حسین نقوی مکان شریف کی کوٹھی کی بیٹھک میں ان کے دوستوں اور ان کے اکتساب فیض کرنے والے ان کے مریدوں کی محفلیں آباد رہتی تھیں میں اکثر اپنی والدہ ماجدہ کے کہنے پر اپنے والد (ڈاکٹر الف۔د۔نسیم) کسی گھریلو کام کی یاددہانی کروانے کے لیے ان محفلوں میں جا بیٹھتا تھا۔یوں کچھ فقر، عاجزی مسکینی کی باتیں میرے کانوں میں پڑ جاتی تھیں۔سید منظور حسین نقوی باشرع صوفی تھے۔۔۔یوں تو مجید امجد کی شاعری ابتدا ہی سے ان کی درویشی اور فقر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن ان کا وہ "میں" کا استعمال جو ان کی کمزوری (آٹو گراف) جیسی نظموں میں ہے۔ان کا خاتمہ منظور حسین شاہ صاحب کی محفلوں میں بیٹھنے سے ہوا۔میرا خیال ہے کہ ان صحبتوں نے مجید امجد کی اناشکنی میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔"(۴۲)

ساہیوال کے شعرا کے تذکرے "شہرِ غزل کے بعد" میں ان کے بارے میں درج ہے:

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم نے ساہیوال میں نوجوانوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی ۔ آپ کی شخصیت کی بہت ساری جہتیں ہیں ۔ آپ ایک بالغ نظر محقق ، ذہین نقاد اور معروف اقبال شناس تھے ۔ اقبال کی تفہیم کے لیے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی "شرح کلیات اقبال" نہایت اہمیت کی حامل ہے ۔ "اقبال اور وحدۃ الوجود" ، "اہل چشت کی ادبی خدمات" اور "میر و سودا کا دبستان دہلی" وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں ۔ بے شمار کتابوں کے مسودے ابھی تک اشاعت کے منتظر ہیں ۔ ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کا حالی روڈ (ساہیوال) پر واقعہ دولت کدہ "مرشد خانے" کا درجہ رکھتا تھا ۔ آپ ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے ۔ اردو غزل کے کلاسیکی مزاج کے رسیا ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کی غزل کا سلسلہ درد ، مصحفی ، آتش اور امیر مینائی کی روایت سے جا ملتا ہے ۔ آپ ایک خوب صورت ، متوازن اور خوش گفتار شخص تھے ۔ ساہیوال کے علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم مرحوم کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ آپ نے شریعت سے طریقت کا سفر بڑی سرعت کے ساتھ طے کیا ۔ آپ کی بزم میں دانش جو ، طلبہ و اساتذہ ، شعرا و ادبا اور نعت خواں حضرات ہر وقت موجود رہتے تھے ۔ دلوں سے دلوں کی باتیں ہوتی تھیں اور متوازن زندگی گزارنے کے اسرار و رموز بڑی خوب صورتی سے سکھائے جاتے تھے ۔ (۴۳)

وصال

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کا دولت کدہ ایک جامعہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ ان کے صاحب زادے ملازمتی امور کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم تھے ۔ ان کا مختلف مواقع پر آبائی گھر میں آنا جانا رہتا ، لیکن عام طور پر دونوں میاں بیوی تنہا رہتے تھے ۔ البتہ نسیم صاحب کے نیاز مندوں کی آمد و رفت جاری رہتی ۔ ان کا گھر ایک چشتی صوفی کی خانقاہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ عمر کے آخری دنوں میں انھیں اپنے جواں سال بیٹے حسن جاوید کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا ۔ پیرانہ سالی کا دکھ اپنی جگہ ، اس پر یہ کہ بینائی بھی کم زور ہوگئی ، اس لیے بیٹوں کے پاس لاہور منتقل ہونا پڑا ۔ بقول علی رضا احمد "ایک دن اداس بیٹھے تھے اور فرمایا میں نے

اپنی ساری زندگی یہاں ساہیوال میں گزار دی ہے لیکن اب پتہ نہیں میری مٹی کہاں ہے"(۳۴)۔

ان کے بغیر شہرِ غزل کی بزمِ ادب تاریک ہو گئی لیکن وقت انھیں وہاں لے گیا جہاں جانا اٹل لگتا ہے، وہیں واصل بحق ہوئے۔ وفات کا سال ۲۰۰۲ء ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی آخری آرام گاہ قبرستان میانی صاحب، لاہور میں ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم تا عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو زندگی کا نصب العین بنائے رہے۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں، مختلف قومی اور بین الاقوامی رسائل و جرائد میں مقالات شائع کروائے۔ ان کی کتابیں اردو زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ایک قناعت پسند درویش تھے۔ انھوں نے میٹرک کے بعد سے اپنے خاندان (والد شیخ شیر محمد، جو تاجر پیشہ تھے مگر نابینا ہو گئے تھے، اپنی والدہ محترمہ رمضان بی بی، بھائی عبدالعزیز، اپنی بہنوں حمیدہ بیگم اور محمودہ بیگم) کی معاش کفالت کی۔ اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم سے لے کر ان کے شادی بیاہ کے سلسلوں تک ان کی دیکھ بھال کی۔ وہ اپنی درویش صفت والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی وفات ان کے والد کی وفات کے اکیس سال بعد ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ وہ اس صدمے سے سالہا سال تک نڈھال رہے۔ اور ان کے ایصالِ ثواب کے لیے حتی المقدور اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید کہتے ہیں:

"ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ایک پاکیزہ عائلی زندگی گزاری۔ اپنی اولاد کی دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت کی۔ ان کی بیگم ثریا بیگم نے ان سے والہانہ عقیدت رکھی۔ وہ بھی ان کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ ہمارا گھریلو ماحول انتہائی خوش گوار تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اور والدہ محترمہ ثریا بیگم کو بڑھاپے میں (۲۰۰۱ء) جوان بیٹے حسن جاوید کی ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کی بدولت وہ شدید ڈیپریشن کا شکار ہو گئے۔ بالآخر وہ بالترتیب جولائی ۲۰۰۲ء اور دسمبر ۲۰۰۲ء میں دارِ فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ یہ صدمہ ہم بہن بھائیوں کو خون کے آنسو رلا گیا۔ ہماری والدہ کا جواں بیٹے کی موت اور والد کی وفات کے بعد اس دنیا سے جی اٹھ گیا۔ وہ کینسر میں مبتلا ہوئیں اور ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی اور والدین کی قبروں کو روشن اور کشادہ رکھے اور انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔"(۳۵)

حوالہ جات

۱۔علامہ محمد اقبال، "کلیاتِ اقبال فارسی"، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۲ء، ص ۳۲۳

۲۔علی رضا احمد، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: ایک عہد ساز شخصیت"، مشمولہ "پیاس"، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۰

۳۔واصف سجاد سے راقم کا انٹرویو، گلستان کالونی ساہیوال، ۱۹ اپریل ۲۰۲۰ء

۴۔ا۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "موجِ نسیم"، مشمولہ ادبی مجلہ "ساہیوال"، گولڈن جوبلی نمبر، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ۱۹۹۳ء

۵۔ا۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "موجِ نسیم"، مشمولہ ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ص ۹۲

۵۔عبدالوحید سعید، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کے تنقیدی و تحقیقی رجحانات"، مشمولہ ادبی مجلہ "راوی"، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۵

۶۔الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "انٹرویو"، روزنامہ "جنگ"، لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء، جریدۂ ادب

۷۔الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "موجِ نسیم"، مشمولہ ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ص ۱۹۲

۸۔الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "موجِ نسیم"، ص ۱۹۲

۹۔ایضاً، ص ۱۹۳

۱۰۔ایضاً، ص ۱۹۳

۱۱۔ایضاً، ص ۱۹۳

۱۲۔واصف سجاد سے راقم کا انٹرویو، گلستان کالونی ساہیوال، ۱۹ اپریل ۲۰۲۰ء

۱۳۔صابر لودھی، پروفیسر، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: ہمہ آشنا"، مشمولہ "پیغامِ آشنا"، شمارہ ۲۷، ۲۰۰۷ء، مدیر محمد سلیم اختر، اسلام آباد، ص ۲۱۲

۱۴۔علی رضا احمد، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: ایک عہد ساز شخصیت"، ص ۲۰۹

۱۵۔ا۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "موجِ نسیم"، مشمولہ ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ص ۱۹۳

۱۶۔ا۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "موجِ نسیم"، ص ۱۹۶

۱۷۔ایضاً، ص ۱۹۴

۱۸۔ایضاً، ص ۱۹۵

۱۹۔ایضاً، ص ۱۹۵

۲۰۔ایضاً، ص ۱۹۵

۲۱۔علی رضا احمد، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: ایک عہد ساز شخصیت"، ص ۲۰۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۲۳۔ صابر لودھی، پروفیسر، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، دردآشنا"، ص ۲۱۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۱۳

۲۵۔ سید محمد اکبر، "گورنمنٹ کالج ساہیوال: عہد بہ عہد"، مشمولہ ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج ساہیوال ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۲

۲۶۔ منصور قریشی، ڈاکٹر، سے راقم کا انٹرویو، گلگشت کالونی ملتان، ۱۲ مارچ ۲۰۲۱ء

۲۷۔ الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "سوزِ نسیم"، ص ۱۹۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۲۹۔ الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "انٹرویو"، روزنامہ "جنگ"، "جریدہ ادب"

۳۰۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، خودنوشت، مشمولہ ماہنامہ "ادبِ دوست"، جنوری ۱۹۹۸ء، مدیر اے جی جوش، لاہور، ص ۴۷

۳۱۔ الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "سوز و حقائق"، ادبی سلسلہ "قرطاس"، جولائی ۱۹۲۹ء، مدیر شرف قدسی، ساہیوال، ص ۱۸۶

۳۲۔ الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر، ۱۰۱ حقائق، "قرطاس"، ص ۱۸۶

۳۳۔ ا۔د۔نسیم، ڈاکٹر، "سوزِ نسیم"، ص ۱۹۲

۳۴۔ سید محمد اکبر، "گورنمنٹ کالج ساہیوال: عہد بہ عہد"، ص ۱۱۲

۳۵۔ صابر لودھی، پروفیسر، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: دردآشنا"، ص ۲۱۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۱۳

۳۷۔ ع۔م۔ حلیم، پروفیسر، "چند یادیں چند باتیں"، مشمولہ "قندیلِ ادب"، ۲۰۰۸ء، مدیر سعد اللہ اسد، ساہیوال، ص ۳۳

۳۸۔ ریاض حسین زیدی، سید، سے راقم کا انٹرویو، فرید ٹاؤن ساہیوال، ۲۲ جولائی ۲۰۱۹ء

۳۹۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، "ارکانِ اسلام، محمد اقبال کی روشنی میں"، غیر مطبوعہ مسودہ، ملکیت ڈاکٹر سعادت سعید

۴۰۔ واصف سجاد سے راقم کا انٹرویو، گلستان کالونی ساہیوال، ۱۰ اپریل ۲۰۲۱ء

۴۱۔ علی رضا احمد، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: ایک عہد ساز شخصیت"، ص ۴۸

۴۲۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، "صد رنگی کونین میں مجمع مانی"، مشمولہ "یہ دنیا امروز میری ہے"، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۵ء، ص ۴۳

۴۳۔ افتخار شفیع، سید علی ثانی گیلانی: "شہرِ غزل کے بعد"، ساہیوال، ادارہ صوت ہادی، ۲۰۰۹ء، ص ۵۶

۴۴۔ علی رضا احمد، "ڈاکٹر الف۔د۔نسیم: ایک عہد ساز شخصیت"، ص ۴۱

۴۵۔ سعادت سعید سے راقم کا انٹرویو، جی سی یونیورسٹی لاہور، ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی ادبی خدمات

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے ناول لکھے ہوں، شعر کہے ہوں، تحقیق کی ہو، تنقید لکھی ہو، اخلاقی و مذہبی تحریریں قلم بند کی ہوں یا علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کی شرحیں لکھی ہوں یہ دعویٰ غیر منطقی نہیں ہوگا کہ ان کا نکتہ جہاں بینی انسان سازی کے آثار لیے ہوئے ہے۔ وہ ان معنوں میں ایک روشن خیال دانشور تھے کہ انھوں نے اپنے تمام تر کلاسیکی رجحانات کا منبع و مرکز مادیت کے مکروہ مشینی دور میں انسان تلاش کو بنایا ہے۔ انسان جسے اس دور بے اماں کی خود غرضیوں نے یا تو قتال بندر بنا دیا ہے یا جا بجا مارا مارا کرنے والا بھیڑیا۔ اردو کی جدید شاعری ہو یا جدید فکشن شاعروں اور فکشن نگاروں نے انسان کے باطن میں چھپے جنگلی وحشی رجحانات کو طشت از بام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہاں میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی اس صوفیانہ فکر کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ جس نے نفس پرست انسانیت کو جا بجا جنگلی جانوروں کی طرح عمل کرتے دیکھا ہے۔ اس حوالے سے ان کے سامنے ہمیشہ مولانا روم کی ایک طویل غزل کے یہ چند اشعار رہے کہ

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
از دیو و دد ملولم انسانم آرزوست (1)

صوفی کی آنکھ نے گوشت پوست کے بظاہر انسانوں کے باطن میں جانور، جنگلی اور وحشی طرز کے جو آثار دیکھے اس سے وہ پریشان ہو جاتی ہے۔ وہ آخری آدمی کے بطور بندروں اور دیگر جنگلی جانوروں میں تبدیل شدہ انسانوں کو از سر نو انسان کے روپ میں دیکھنے کا متمنی ہو کر اصلاح و تطہیر کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ یہ صوفی ترک دنیا کرنے کی بجائے دنیا کا سامنا کرنے کا حوصلہ و مشن رکھتا ہے۔

دور جدید ہو کہ قدیم انسانی کایا کلپ کے تخیلی و حقیقی مناظر سے شعر و ادب و مذہب کے سلسلے بھرے پڑے ہیں۔ عہد حاضر میں کایا کلپ یا میٹامورفسس یا جون کی تبدیلی کے سلسلے کا آغاز کافکا سے منسوب

کر کے مغرب مرعوبی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ لیکن قدیم مذہبی اور ادبی داستانوی سلسلوں کو اس ضمن میں فراموش کر دیا جاتا ہے۔ انسانوں کی سزا کے طور پر کایا کلپ مختلف ادیان کے صحیفوں میں جا بجا موجود ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی فکری اپروچ کا یہ بنیادی نکتہ انھیں ان کے مرشد (خواجہ محمد دیوان چشتی صابری رحمتہ اللہ) کے عطا کردہ فیضان سے حاصل ہوا۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ۱۹۲۰ء میں برطانوی استعمار کے زیر تسلط ہندوستان کے ایک شہر ہوشیار پور میں ہوش کی آنکھ کھولی۔ پاکستان کے قیام ۱۹۴۷ء تک انھوں نے متحدہ ہندوستان میں برطانوی چیرہ دستیوں کا سیاست، معیشت، ثقافت، سماجیات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں غلام ہندوستانی فرد کی حالت زار کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انگریز کی تقسیم کرو اور حکمرانی کرو کی میکاویلین پالیسی کا انھیں مسلمان ہونے کے ناتے تعلیمی اداروں کے انتخاب سے لے کر ابتدائی ملازمت کے حصول تک جا بجا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مغل مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا۔ اس لیے اس کا انھیں ایک دشمن کے طور پر دیکھنا (ان کی سرکشیوں، بغاوتوں اور مزاحمتوں کی تاریخی صورت حال کی بدولت) ایک فطری امر تھا۔ ہندوستان کے اقتدار میں فی صد فارمولوں کے تحت ہندوؤں، سکھوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھرپور نمائندگیاں ملیں اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو ان کی نفرت انگیزیوں کا شدت سے نشانہ بننا پڑا۔ ایسے میں تجارتی لین دین سے لے کر اعلیٰ ملازمتوں کے حصول تک مسلمانوں کے مقابلے میں دیگر مذاہب کے لوگوں کو فوقیت ملتی رہی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی تحریروں میں انگریزوں کی ثقافت اور انتظامی امور پر کھلی تنقید اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ استعماری اسیری کے دور کے خلاف اپنے شدید رد عمل کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے شعر و ادب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کو ایک ایسے ملک کی طرح دیکھنا چاہتے تھے کہ جس میں مذہبی اعتبار سے اقلیتی و اکثریتی کی مغربی جمہوری تقسیم کی بجائے ہندوستان کے تمام انسانوں کو مساوی حقوق کا ثمر مند سمجھتے تھے۔ لیکن "تقسیم کرو اور اقتدار میں رہو" کی پالیسی ہندو نوازیوں کی سبب ہوئی۔ اس لیے انھیں مسلمانوں کے حقوق کی جنگ کے لیے مجبوراً ایک آزاد ملک کا مطالبہ درست لگنے لگا۔ انھیں ہندوستان سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے اپنی تحقیق و تنقید کا منبع مغل دارالسلطنت (عالم میں انتخاب) دلی کو بنایا۔ انھوں نے اس سلسلے میں دلی کے شاعرانہ ماحول، خواجہ میر دردؔ، خاندان شاہ ولی اللہ، میر حسن جیسے موضوعات کو منتخب کیا۔ ان کے تحقیقی کام میں خواجہ میر دردؔ کے

شاگرد، اردو کے چند مرثیہ نگار، اردو شاعروں کے معاشقے، اردو کے منظوم عشقیہ قصے، مذہبی و اخلاقی مثنویاں وغیرہ کا زیادہ تر مواد دہلی کے ادیبوں اور شاعروں سے ہی نسبت رکھتا ہے۔ ان کے یہ اشعار میرے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں:

کیوں طعنۂ غربت ہمیں دیتے ہو عزیزاں ہم بھی تو کسی دیس سے آئے ہیں اجڑ کے
وہ دیس کہ جس دیس کی ہر راہ تھی جنت وہ راہ کہ جس راہ پہ چلتے تھے اکڑ کے
یاد آئے ہے ہم کو بھی نسیم اپنے وطن کی جب مرغ گرفتار قفس میں کوئی پھڑکے (۲)

ان کا خیال تھا کہ جب پنجاب کی ناحق تقسیم ہوئی اور مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو جبراً باہر نکالا گیا تو ان کا خاندان بھی مشکلیں جھیلتا مغربی پنجاب میں آ بسا۔ پنجاب کے مسلمانوں کو یہ معلوم تھا کہ پنجاب بطور مسلم اکثریتی صوبہ پورے کا پورا پاکستان میں شامل ہوگا مگر باؤنڈری کمیشن نے کانگرس کے عندیے پر اس کی غیر منطقی تقسیم کر دی یوں مسلمانوں کو اپنے صدیوں پرانے آستانوں کو چھوڑنا پڑا اور ان کا کانگرس نواز سکھوں نے بڑے پیمانے پر قتل عام کیا۔ یہ قتل عام ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے ان کے سینے پر گہرے گھاؤ لگائے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہی سکھ جن کا مسلم گھرانوں سے قریبی تعلق تھا کانگرسی سیاست کی بدولت ان کے جانی دشمن ہو کر ان کا خون بہانے لگے۔

قومی تشخص کی تلاش

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے پاکستان کو جب اپنے وطن کے طور قبول کیا تو اس کے بعد ان کے اندر اس نئی مملکت کے لیے ایسے اعلیٰ جذبات پیدا ہوئے کہ انھوں نے اپنے شعر و ادب کے راہواروں کا رخ اس مملکت میں بسنے والے لوگوں کے تشخص کی منزلوں کی جانب کیا۔ ان کے شعر و ادب میں جا بجا پاکستانیت کے نقوش ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے قائداعظم محمد علی جناحؒ سے ان کی والہانہ عقیدت تھی۔ وہ کسی سے ان کے خلاف کوئی کلمہ سننے کے روادار نہیں تھے۔ علامہ اقبالؒ کے تصور پاکستان کو انھوں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ان پر ایسے زاویوں سے تحقیق کی جن کا مرکز مسلم تہذیب کی بازگشت کا جذبہ تھا۔ اسی سیاق و سباق میں ان کی کتب اور مقالہ جات میں پاکستانی تشخص کی تلاش کا کام اظہر من الشمس ہے۔ ان کے علمی و ادبی سرمائے میں ان جڑوں کی جانب رجوع کے سلسلے ملتے ہیں کہ جن کی بنیاد پر پاکستان جیسی دنیا کی عظیم سلطنت کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی توجہ ہمیشہ پاکستان کے وجود کے مرکزی نقطہ کلمہ طیبہ پر مرکوز رہی۔ ان کی خدا دوستی اور نبی ﷺ سے عقیدت بے مثال تھی۔ پاکستان کو مملکت خداداد جانتے ہوئے وہ اس کی حقیقی خود مختاری اور آزادی کے داعی تھے۔ اسی لیے ان کے شعر و ادب میں جا بجا مغربی استعمار کی ان ریشہ دوانیوں کا تذکرہ ملتا ہے کہ جن کی بدولت وہ آزاد ملکوں کو اپنا دست نگر بنا کر انھیں غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں دھکیل دیتے ہیں۔ علامہ اقبال اپنے ایک قطعے میں کہتے ہیں:

شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رند لم یزل
رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام
رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
حضرت کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور
حکم برداری کے معدے میں ہے درد نایطاق
وفد ہندوستاں سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پے ہضم فلسطین و عراق؟

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اس قطعہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پہلی جنگ عظیم کے دور میں ترکی ایک وسیع مملکت شمار ہوتی تھی۔ عرب بھی اس کے زیر نگیں تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو کمزور کرنے کے لیے عرب ممالک کو اکسایا کہ وہ ترکی کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس بغاوت کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ حجاز کی سلطنت شریف حسین کے حصے میں آئی۔ شام کی مملکت امیر فیصل کو تفویض ہوئی۔ امیر عبداللہ شرق اردن اور عراق امیر زید کے زیر تسلط آ گیا۔ فلسطین کو انگریزوں نے اپنے زیر انتظام رکھا بلکہ عراق اور فلسطین کے لیے ایسا نظام حکومت طے کیا جسے سیاسی اصطلاح میں منڈیٹ یا حکم برداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ عراق اور فلسطین کے حکمران دونوں انگریز کی زیر کفالت نظام حکومت چلائیں گے۔ مگر یہ تجویز پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ شام کے باشندوں نے امیر فیصل کی

حکمرانی کو مسترد کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا اور اس میں شرکت کے لیے فرانس کو شام سے اپنی افواج بلوانی پڑیں۔ یہ سلسلہ یوں تو جنگِ عظیم کے بعد بھی جاری رہا لیکن اقبال نے زیرِ تشریح قطعہ شام سے فرانسیسی فوج کی واپسی کے پس منظر میں ہی لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ فرانسیسی عساکر جو ہمیشہ شراب میں بدمست رہا کرتے ہیں اب مجبور ہو کر شام کی سرحدوں سے واپس جا رہے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے پسپائی کے وہ اطوار بھی نظر انداز کر دیے ہیں جو مبارزت کے حوالے سے پیش آیا کرتے ہیں۔ بہرکیف فرانسیسی افواج شام سے فرار ہو گئی ہیں۔ یہ بڑا عبرت انگیز مقام ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کس طرح تغیر پذیر ہوا کرتے ہیں۔ لارڈ کرزن جو ان ایام میں برطانیہ کا وزیرِ خارجہ تھا اور بعد میں ہندوستان کا وائسرائے بنا اسے عراق و فلسطین میں حکم برداری کا نظام ناکام ہوتا نظر آیا تو سر آغا خاں کے مشورے سے ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان طلب کیا۔ اس ضمن میں اقبال استفسار کرتے ہیں کہ کیا یہ وفد اس لیے ترتیب دیا جا رہا ہے کہ اس کی وساطت سے انگریز عراق و فلسطین کو باسانی ہضم کریں۔ اس قطعے سے اقبال کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ (۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے علامہ اقبالؒ کے کلمہ طیبہ کی نسبت سے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں بار بار اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ مسلمانوں کو بندے ہونے کے اعتبار سے صرف اور صرف خدا کے آگے جھکنا ہے۔ اس سیاق و سباق میں انھوں نے لا ملوکیت، لا آمریت، لا کلیسائیت اور لا استعماریت کے نعرے لگائے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی رباعیات کے مجموعے "مجھے ہے حکمِ اذاں" میں معرفتِ خدا کے فکری و کیفیاتی خزینے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں مسئلہ وحدۃ الوجود کے تناظر میں لکھی گئی ان کی بے شمار تحریریں عشقِ الٰہی کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔

کلمہ طیبہ کا دوسرا جزو اعترافِ رسالت پر مبنی ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے "نورِ مجسم" اور "حیاتِ النبیؐ" جیسی بلند پایہ تحقیقی کتابیں قلم بند کیں۔ "نسیمِ طیبہ" اور "نسیمِ رحمت" جیسے نعتیہ مجموعے تخلیق کیے۔ درود و سلام اور نعمائے درود و سلام کے موضوع پر علمی تحقیق کی۔ وہ جب بھی محمد مصطفےٰ

ﷺ کا ذکر سنتے یا ذکر کرتے ان کی آنکھیں عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر اشک بار ہو جاتیں۔ ان
کے لاتعداد ملنے والے ان کے عشق نبی ﷺ کے احساسات کی تائید میں رطب اللسان رہے ہیں۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ادبی اور علمی مرتبے کو پہچاننے کے لیے جس تحقیقی بصیرت کی ضرورت ہے
اس کی طرف تا حال زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔ وہ ایک منظم فکری نظام کے حامل صاحب الرائے انسان
تھے۔ انھوں نے جو تین ناول لکھے ان میں ان کی فکری و احساساتی اعتقادات کی جھلکیاں موجود
ہیں۔ برصغیر میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی ہزیمت کے اثرات کو کم کرنے کے لیے سرسید احمد
خان، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر کی تقلید میں مسلمانوں کے شان دار
ماضی کو یاد کرنے کے جن سلسلوں کا آغاز ہوا تھا، اسے پاکستان بننے کے بعد تک اہمیت حاصل
رہی۔ برصغیر کے مسلمان مصنفین نے ہندستان کی عظیم سیاسی، علمی اور ثقافتی مسلم روایتوں کو اس لیے
شان دار طریقوں سے قلم بند کیا تا کہ انھیں اپنے آزاد ماضی کا متواتر احساس ہوتا رہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اس حوالے سے "سادھو اور روشنی" کے عنوان سے ناول لکھا جس میں اکبر
اعظم کی فتح چتوڑ گڑھ کو اس انداز سے موضوع بنایا کہ اس میں مذہبی تاریخ کی دمک نمایاں رہی۔ اس ناول
کا ہیرو مسلم فوج کا سپہ سالار ہندو لڑکی کو دائرہ اسلام میں لا کر اس سے شادی کرتا ہے۔ غلام ہندستان کے
مسلمان اپنی شان دار تاریخ کو پڑھنا پسند کرتے تھے۔ الف۔ د۔ نسیم کا دوسرا ناول "بے گناہ سورما" ایک
ہندو لڑکی پر ہونے والے سماجی مظالم کی داستان سناتا ہے۔ اس ناول سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی
اکثریت ہندو مسلم میل جول کو نہ صرف پسند کرتی تھی بلکہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام بھی
آتی تھی۔ اپنے علمی، تحقیقی و تنقیدی اپروچ اور مذہبی و صوفیانہ جہت نمائی کے سبب وہ چاہتے تھے کہ یہ
ناول کسی اور کے نام سے چھپیں چناں چہ انھوں نے اس کے لیے سعادت بن نسیم کا فرضی نام منتخب کیا تھا۔
"سادھو اور روشنی" کے پیش لفظ میں وہ ایمان افروز خیالات موجود ہیں جو بعد میں ان کے ادبی، علمی اور
تنقیدی سرمائے کا جوہر بنے۔

ان کے خیال میں مسلمان ہندستان میں بت پرستی کی جگہ خدائے وحدہٗ لا شریک پر اس لیے ایمان
لائے کہ یہاں مبلغین کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو مختلف وقتوں میں اولیائے کرام کی طرف سے ملک کے
کونے کونے میں بھیجے جاتے تھے۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد اور فاتح سندھ محمد بن قاسم جیسے بے
باک، بے خوف، مدبر اور بہادر جرنیل شمع اسلام کے چند پروانوں کے ساتھ آہنی فوج کے بحر زخار میں کود

بڑھتے تھے اور آنکھ جھپکنے سے پہلے کفر وظلمت کی ان وادیوں میں اپنے مبارک ہاتھوں سے پرچم ہلالی نصب کر دیتے تھے۔ ان کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کی تعلیم اقدس و اطہر اور خلفائے راشدینؓ کے کارنامے اور قربانیاں اور مردہ جسموں میں نئی روح پھونک دینے والی تکبیریں تھیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو تاریخ اردو پائی کے ورق الٹو اگر مسلمان چاہتے تو اپنے مخالفین کو مارتے پیٹتے اور انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتے اور انکار کرنے پر تہ تیغ کر دیے جاتے۔ انھوں نے ظلم و جبر قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کرنے کی بجائے مئے حجازی کے جام پلائے جس کے زیر اثر لوگ خود بخود مسلمان ہوتے چلے گئے۔ حاسدین اسلام تاریخ ہند کا مطالعہ کریں تو وہ جان لیں گے کہ مسلمانوں نے ظلم نہیں کیے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو علاقے ابھی تک فتوحات اسلام کے عمل سے بے پناہ سے بچے ہوئے تھے اور جہاں جہاں ایسے علاقوں میں مسلمان آباد تھے۔ ان پر جینا دوبھر کر دیا گیا تھا۔ ان کے گھر بار لوٹ لیے گئے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان پر طرح طرح کے ظلم کیے گئے۔ ان کو قسم قسم کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائی گئیں۔ ان سے وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا گیا مگر وہ راہ حق پر ثابت قدم رہے۔ انھوں نے خدائے پاک کا شکر ادا کر کے تنگ دستی و افلاس کی مصیبتیں اور مخالفین اسلام کی سختیاں برداشت کیں۔ لیکن زباں پر حرف شکایت تک نہ لائے اور انھوں نے صبر و شکر سے اپنی زندگیاں کاٹ دیں۔ وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ظلمت کے بادل چھٹ جائیں گے۔ باطل کی گھٹائیں ختم ہو جائیں گی اور آفتاب اسلام کی زریں کرنیں لوگوں کے سیاہ دلوں کو روشن بنا دیں گی۔ ان کو معلوم تھا کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے والا تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا کہنا ہے کہ اولیائے عظامؒ کی روحانی تعلیم نے ہی ہندو راجاؤں کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا تھا۔ مسلمان صوفیا اور فقرا میں مذہبی جوش تھا۔ پرہیزگاری اور اتقا تھا۔ جذبۂ عمل تھا اور ان کی کرامات اور تعلیم سے متاثر ہو کر لاکھوں آدمی مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سب سے پیش پیش تھے۔ وہ پرتھوی راج کے وقت شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان میں آئے۔ انھوں نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ خواجہ صاحبؒ نے حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ کو اپنا خلیفہ اول بنا کر پنجاب کے راجپوتوں کو داخل اسلام کرنے کے لیے پاک پتن شریف بھیج دیا تھا۔ اور حضرت بابا فریدؒ نے اپنے بھانجے حضرت علی احمد صابرؒ کو کلیر شریف کی خلافت عطا کی اور ان کو کوہ ہمالیہ کے چندو توں اور جاتوں کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے بھیجا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت شمس سبزواریؒ، حضرت لعل شہبازؒ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ،

حضرت میاں میرؒ، شاہ چراغ حسنؒ، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ اور دیگر صوفیائے اکرام ہندوستان کی کئی علاقوں میں دینِ اسلام کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ یہ سب ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کی تبلیغ، تلقین، تعلیم اور کشف و کرامات سے اسلام روز بروز ہندوستان میں ترقی کرتا گیا۔ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا تو جہاں جہاں اسلامی حکومتوں کے مراکز تھے وہاں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہوتی۔ دیگر اقوام کی تہذیب اور تمدن صفحۂ ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جاتی۔ کیوں کہ ان علاقوں میں تلوار اپنا پورا اثر رکھتی تھی۔ مسلمان بادشاہ جو سلطنتوں کی سلطنتیں زیر و زبر کر جاتے تھے، جن کی ہیبت اور عظمت کا سکہ ہندوستان کے کونے کونے پر بیٹھا ہوا تھا جن کے جاہ و جلال کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجتا تھا ان کے لیے یہ کام کیا مشکل تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی شمشیر آبدار کے جوہر دکھاتے۔ سرزمین ہندوستان میں لکھنؤ، دہلی، آگرہ اور لاہور اسلامی حکومتوں کے مراکز رہے ہیں۔ ۱۸۲۰ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان علاقوں کے گرد و نواح میں مسلمان دس فیصدی اور کہیں کہیں اس سے کم یا زیادہ تناسب میں آباد نہیں ہیں۔ لاہور سکھوں سے گھرا ہوا ہے۔ دہلی اور آگرہ کے گرد ہندو جاٹ آباد ہیں۔ لکھنؤ کے گرد اگرد بھی ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مسلمان چودہ فیصدی سے زیادہ نہیں یہ سب اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو کبھی تنگ نہیں کیا بلکہ مسلمانوں سے بھی زیادہ حقوق دیے۔ تنگ نظر بہ سچائی ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا تو ان علاقوں میں جو ہر وقت بادشاہ وقت کے زیرِ نظر رہتے تھے آج ہندو اکثری بیجات میں کیوں ملتے۔ ہندوؤں نے غلط بیانیاں کر کر کے تاریخ کو جھوٹے قصوں اور ڈھکوسلوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ اصل واقعات کو چھپانے کی بے حد کوشش کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو ظالم اور ناکشش ثابت کرنے میں مہاشوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔ لیکن باطل لاکھ چاہے پر وہ کبھی حق پر نہیں ڈال سکتا۔ الف۔ د۔ نسیم کہتے ہیں:

"میں نے اس ناول میں اصل واقعات کو سپردِ قلم کیا ہے۔ حقیقت کو بے نقاب کیا ہے اگر ناقدین جو کچھ اس ناول میں لکھا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کیوں اور کیسے پھیلا۔" (۳)

یہ ناول قیامِ پاکستان سے قبل لکھا گیا تھا۔ اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف دانستہ پھیلائی جانے والی جھوٹی افواہوں کا ازالہ کیا جا سکے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے قیامِ پاکستان کے بعد جو ادبی، علمی، تنقیدی اور تحقیقی کام کیا اس کی بنیاد ان کے بالا نظریات بنے۔ پاکستانی شناخت کی تلاش

انھیں راہ سجھائی کہ وہ شاہ ولی اللہ اور خواجہ میر درد پر تحقیقی کام کریں۔ اردو شاعری کے مذہبی اور فلسفیانہ جائزے سے برصغیر کی مسلم ثقافت کو اجاگر کریں۔ اسی سلسلے ہی کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے بارہویں صدی ہجری کے دہلوی ادب و کلچر پر غیر معمولی تحقیق کی۔ اسی پس منظر میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے اردو کے منظوم مذہبی قصوں اور عشقیہ اور صوفیانہ مثنویوں پر کیے جانے والے کام پر تحقیقی کام کو بھی دیکھا جانا چاہیے۔ اردو ناول، افسانہ، ڈراما پر ان کے تنقیدی کام کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے جا بجا مغربی تہذیب کو نشانہ تنقید بناتے ہوئے مشرقی انسانی اور ثقافتی اقدار کا علم بلند کیا ہے۔ اردو زبان کے سلسلے میں وہ بہت حساس تھے۔ اسے وہ پاکستان کی قومی زبان کے طور پر رائج کیے جانے کے حق میں تھے۔ اردو زبان میں موجود ادبی و شعری اصطلاحات پر کام کرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کے مذہبی، صوفیانہ اور قومی تشخص کو پیش نظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اقبال کے کلام میں موجود اسلامی حوالوں پر بھی تفصیلی کام کیا ہے۔ اردو اور تحریک پاکستان کے حوالے سے ان کا واضح موقف ہے۔ حسن رضوی کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا: ''تحریک پاکستان سے میری دلچسپی کہ لیجیے کہ میں نے اس تحریک کے ایک جزو اردو زبان کو اپنایا۔ مجھے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی اولین کلاس میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ علاوہ ازیں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زیر صدارت منعقد ہونے والی پاکستان کی پہلی اردو کانفرنس میں پاکستان میں اردو کے مستقبل کے حوالے سے ایک مقالہ پیش کرنے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا ہوں۔ میرے استاد محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے انجمن ترقی اردو لاہور کی طرف سے اردو کے لیے میری خدمات کے صلے میں مجھے ''محب اردو'' کے خطاب سے بھی نوازا ہے۔ اردو زبان کے نفاذ کے لیے کی جانے والی میری کوششوں پر مشتمل ایک غیر مطبوعہ کتاب انجمن ترقی اردو کراچی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اور بزم اقبال لاہور کے کتب خانوں میں موجود ہے جس میں انجمن تحفظ اردو ساہیوال کے پلیٹ فارم سے نفاذ اردو کے سلسلے میں کی جانے والی مساعی کا تفصیلی تذکرہ ہے''(۵)

الف۔ د۔ نسیم کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ پاکستان میں اردو سے زیادہ انگریزی زبان رائج ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مقتدرہ قومی زبان اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اگر مقتدرہ کے صاحبان کرسی چاہتیں اردو کو بطور قومی زبان رائج کروا سکتے تھے تو آج تمام سرکاری کام اسی زبان میں ہو رہے ہوتے۔ اشتیاق احمد قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے ذمہ دار ادیب بھی اردو کو اس کا حق

نہیں دلوا سکے آج بھی انگریزی برطانوی اور امریکی لہجوں سمیت ہم پر مسلط ہے۔ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا خیال تھا کہ

> ”اردو کا نفاذ آئین کے مطابق بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن آئین کی خلاف ورزی کو تو ارباب بست و کشاد ہی روک سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ۸۳۔۱۹۸۲ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ایک نوٹیفکیشن بھی جاری ہوا تھا کہ اس سال سے دسویں جماعت کے امتحانات اردو ذریعہ تعلیم میں ہوں گے لیکن نہ جانے کس سازشی ہاتھ نے اس سکیم کو سرے چڑھنے نہ دیا اگر ایسا ہو جاتا تو انگریزی تہذیب و تمدن پھیلانے والے ادارے خود بخود ذریعہ تعلیم اردو کر لیتے ہمارا مطالبہ ہے کہ آئین کے مطابق اس حکم کو دوبارہ نافذ کیا جائے۔“(۶)

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم دو بطور ادیب اور شاعر تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب سے بھی گہرے طور پر وابستہ تھے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

> ”اپنے ادبی کیریئر کا آغاز تو میں نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں دو تین ناول لکھے تھے ایک کا نام ”منورما کی کہانی“ تھا اس میں ایک مجبور ہندو عورت کی چتا قلم بند کی تھی۔ دوسرا تاریخی ناول تھا جس میں قلعہ چتوڑ کی فتح اور اس کے تاریخی و تہذیبی اثرات کی نشان دہی کی تھی۔ بعد ازاں میں نے تنقید، تحقیق اور فکر کے میدانوں سے ہم آہنگی محسوس کی۔ ایک عرصے تک اردو اور فارسی غزلیں بھی کہی ہیں۔ آج کل میرا رجحان نعت نویسی کی طرف ہے۔“(۷)

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم دین کو سیاست سے الگ رکھنے کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے کہ ایسا کرنے سے چنگیزیت کے خونی باب کھل جاتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ:

> ”ہر مسلمان کسی نہ کسی حد تک مذہب کی جانب ضرور مائل ہوتا ہے۔ میرے مذہب اور تصوف کی طرف جھکاؤ میں میری درویش صفت والدہ کی تربیت کا خاصا عمل دخل ہے۔ وہ تصوف کے سلسلہ چشتیہ سے وابستہ تھیں ان کے مرشد خواجہ محمد دیوان چشتی صابری تھے جو حافظ کرم بخش چشتی صابریؒ کے مرید تھے۔

میں بھی دیوان صاحب کا مرید ہوں۔ میری والدہ کو صوفیانہ اور مذہبی شعر و ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ ان کے سرہانے سلطان باہوؒ، بابا بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، میاں محمد بخشؒ، بابا فریدؒ کا کلام موجود رہتا تھا۔ وہ قرآن و حدیث کی کتب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ کشف المحجوب (داتا گنج بخشؒ) اور منطق الطیر (فریدالدین عطارؒ) کے تراجم کا مطالعہ بھی کیا کرتی تھیں۔ ان کی تقلید میں میں نے بھی صوفیانہ اور مذہبی ادب کی جانب توجہ کی۔" (۸)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم پاکستانی ثقافت کی تلاش و تشکیل کے عمل کو پاکستان کے ادبی، تاریخی اور ثقافتی اداروں کی بنیادی ذمہ داری گردانتے تھے۔ اس سلسلے میں انجمن، مجلس ترقی ادب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، مرکزی اردو بورڈ، سائنس بورڈ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، بزم اقبال، اقبال اکیڈمی کی کاوشوں پر فخر تھا۔ یہ ادارے تاریخ، فلسفہ، ادب، ثقافت، پاکستان اور اقبالیات کے ضمن میں اہم کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی تجویز تھی:

"جو موضوعات پاکستانی ادب و ثقافت کے حوالے سے نظر انداز کیے گئے ہیں ان پر باقاعدہ کتابیں لکھوائی جائیں اور انھیں سستے داموں عوام تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلے میں گورنمنٹ کو بھی پوری دلچسپی سے ان اداروں کی دیکھ بھال کرنا چاہیے اور سنجیدہ علمی و ادبی کام کرنے والے دانشوروں کی خدمات مستعار لینی چاہئیں۔ پاکستان کا ایک عام پبلشر اگر تھوڑے سرمائے سے ایک سال میں سو سے زائد کتابیں شائع کر سکتا ہے تو کم از کم ان میں سے ہر ایک ادارہ پچاس کا ٹارگٹ تو پورا کرے۔ ہمارے علمی اداروں کو چلانے کے لیے اگر پڑھے لکھے نوجوانوں کو ترجیح دی جائے تو یہ بہتر ہوگا کیوں کہ مستقبل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہر ترقی یافتہ قوم قیادت نوجوانوں ہی کو سونپتی ہے۔ تھکے ماندہ ریٹائرڈ افراد زیادہ دل جمعی سے کام نہیں کر سکتے۔ اور اگر کسی غیر معمولی حیثیت کے ریٹائرڈ آدمی کی خدمات بہت ضروری ہوں تو بھی اس کے ساتھ ایسے افراد کو وابستہ کیا جائے جو محنت اور لگن سے نئے منصوبے بنا سکیں اور ان پر عمل بھی کر سکیں۔ مزید برآں ہر ادارے کے مزاج کے مطابق

سربراہ منتخب کیا جاتا چاہیے۔''(۹)

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ایک باعمل صوفی تھے۔ان کی محفلوں میں معرفت الٰہی،عشق نبی ﷺ،تاریخ اسلام،سوانحات و در سیرت صوفیہ،فضیلت اسلام،سربلندی پاکستان اور عصری غیر اسلامی سیاست پر طویل ذکر اذکار کے سلسلے جاری رہتے تھے۔قرآن پاک،احادیث نبوی،کلام اقبال،غالب،اردو،وغیرہ بھی وہ موضوعات تھے جن پر وہ انتہائی روانی اور تحقیقی جاں فشانی سے باتیں کیا کرتے تھے۔مشہور بین الاقوامی ماہر لسانیات پروفیسر انور شبنم دل نے اپنی کتاب ''سلف ان پاکستانی لنگو سٹکس''مطبوعہ جنوری ۱۹۶۵ء،از لنگو سٹکس ریسرچ آف پاکستان،کیلی فورنیا یو ایس اے میں ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کو نمایاں ماہرین لسانیات کے طور دیکھتے ہوئے ان کے تحقیقی اور علمی و ادبی کام کی پذیرائی کی ہے۔شکرگڑھ میں فیض احمد فیض سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔علاوہ ازیں سعادت سعید کے ساتھ ن۔م۔راشد بھی ان کی رہائش گاہ پر تشریف لائے۔ان سے تصوف اور ادب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔

ڈاکٹر سعادت سعید کا کہنا ہے:

''میرے والد ڈاکٹر الف۔د۔نسیم نے میری اور بہت سے دوسرے طلبہ کی تربیت میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔میں سالہا سال ان کی محفلوں میں شریک رہا ہوں۔مجھے تصوف،تاریخ،سیاست،اخلاقیات،فلسفہ،شعر و ادب کی طرف لانے میں وہ میرے محمد و معاون ثابت ہوئے۔گورنمنٹ کالج شکرگڑھ میں بی۔اے میں وہ میرے باقاعدہ استاد بھی تھے۔ان سے میں نے مختلف موضوعات پر علمی باتیں سنیں۔لیکچر دینے کا ہنر سیکھا۔علاوہ ازیں یہ اکتساب کیا کہ مختلف علوم اور موضوعات کی تدریس کیسے کی جاتی ہے۔وہ کلاسیکی مزاج کے آدمی تھے انھوں نے میری تربیت انھی بنیادوں پر کی۔میں نے ان سے میر،سودا،درد،غالب،اقبال کی شاعری پر باقاعدہ درس لیے۔انھوں نے مجھے بحرالفصاحت (نجم الغنی) اور مراۃ الشعر (عبدالرحمان)،بانگ درا،اسرار خودی،پیام مشرق،بال جبریل،زبور عجم،جاوید نامہ اور علامہ اقبال کی دیگر کتابوں کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔اس مشورے پر میں نے حتی المقدور عمل کیا۔ان کے وسیع کتب خانے سے بھی میں استفادہ کیا کرتا تھا۔میں ان کی تحریروں کو ایک عاشق کی طرح پڑھا کرتا

تھا۔ رسالہ اردو، اورینٹل کالج میگزین، ادب لطیف، ادبی دنیا، نئی قدریں میں
شائع ہونے والے ان کے مضامین میری نظر سے گزرتے تھے۔ جب میں بی
۔اے میں پڑھتا تھا تو انھوں نے میری تربیت کے لیے مجھے دو ماہ کے لیے
منٹگمری سے لاہور صرف اس غرض سے بھیجا تھا کہ میں قدیم اردو، دکنی ادب،
ادبی اختلافِ تحریر پنجاب یونیورسٹی میں موجود مواد کی ورق گردانی کروں اور اس
میں سے مطلوبہ شواہد اکٹھے کروں۔ اس سلسلے میں مجھے مختلف مخطوطے دیکھنے اور
دکن اور بمبئی کے تحقیقی اداروں کے رسائل سے بھی استفادہ کرنے کا قیمتی موقع
ملا۔ اس دور میں مجسم کاشمیری اور گوہر نوشاہی، سید فیاض، محمد الطاف، سید
عبداللہ، وقار عظیم جیسے لوگوں سے رہنمائی لینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حقیقت
یہ ہے کہ یہ دور میری اردو زبان و ادب سے گہری وابستگی کا دورِ آغاز ثابت ہوا اور
بعد ازاں میں نے ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ملنے والے ایم اے
انگریزی کے داخلے پر اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کرنے کو ترجیح دی۔ اس
سلسلے میں ایک حسنِ اتفاق کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ میرے والد ڈاکٹر
الف۔ د۔ نسیم پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پہلے گولڈ میڈلسٹ تھے اور یہ
اعزاز مجھے ۱۹۶۹ء میں حاصل ہوا۔ علاوہ ازیں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی
شعبہ اردو کے پہلے ریسرچ سکالر کے طور ۱۹۵۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری
حاصل کی۔ مجھے پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز ۱۹۸۸ء میں ملا۔"(۱۰)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے مذہبی رجحانات پر اردو شاعری کے اس آزاد خیال رجحان کا اثر بھی ہوا جس کے مطابق مسجد و بت خانہ، زمزم و میخانہ، دیر و حرم کی نفرت پیدا کرنے والی تقسیمیں انسانوں کے لیے مفید نہیں ہیں۔ چناں چہ بطور شاعر وہ الحاقی محبت میں کعبہ و دیر کی تفریق سے گریزاں ہو کر بھی بات کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی غزلیں کہ جو ان کے غیر مطبوعہ شعری مجموعے "نسیم غزل" میں موجود ہیں ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

کعبہ و دیر کی تفریق ہے تقصیرِ نظر
کارواں ایک ہی منزل کو رواں ملتے ہیں (۱۱)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی ادبی خدمات پر روزنامہ دی نیوز لاہور میں فرحت حسن کا ایک کالم شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "ایک عالم جس کی روایات ہنوز باقی ہے"۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم سے روزنامہ جنگ لاہور کے ادبی صفحے کے انچارج حسن رضوی نے بھی ایک انٹرویو لیا تھا۔ میزبان حسن رضوی کے اس سوال کے جواب میں کہ "ڈاکٹر صاحب آپ ادبی حلقوں میں بطور محقق جانے پہچانے ہیں۔ خواجہ میر درد، خاندان شاہ ولی اللہ، ستر ہویں صدی کا دہلوی ادب، دکنی ادب، اردو کے منظوم مذہبی قصے، صوفیانہ مثنویاں، فلسفیانہ اور مذہبی ادب، اردو ناول، افسانہ، ڈرامہ، ادبی و شعری اصطلاحات، اردو زبان اور اقبالیات وغیرہ سے متعلق بہت سے موضوعات کو آپ نے اپنی تحقیق و تنقید کی بنیاد بنایا ہے۔ یہ فرمایئے کہ تخلیقی ادب سے آپ کی دلچسپی کس نوعیت کی ہے؟" الف۔ د۔ نسیم کا کہنا تھا:

> "اپنے ادبی کیریئر کا آغاز تو میں نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں دو تین ناول لکھے تھے ایک کا نام منورما کی کہانی تھا اس میں ایک مجبور ہندو عورت کی بپتا قلم بند کی تھی۔ دوسرا تاریخی ناول تھا جس میں قلعہ چتوڑ کی فتح اور اس کے تاریخی و تہذیبی اثرات کی نشاندہی کی تھی۔ بعد ازاں میں نے تنقید، تحقیق اور فکر کے میدانوں سے ہم آہنگی محسوس کی۔ ایک عرصے تک اردو اور فارسی غزلیں بھی کہی ہیں۔ آج کل میرا رجحان نعت نویسی کی طرف ہے۔"(۱۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے علمی اور ادبی سرمائے کا سرسری جائزہ اس امر کی نشان دہی کر سکتا ہے کہ انھیں فکر و فلسفہ کے دقیق مسائل کو عمومی زبان میں پیش کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی صوفیانہ خصائص کی حامل شخصیت انسانی تربیت کے معاملات سے مکمل آشنائی رکھتی تھی۔ جوانی میں توبہ کرنے والے اس عظیم انسان نے انسانی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یہ ان کی افتاد طبع کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے خواجہ میر درد کے کلام میں تصوف کے عنوان سے ایم۔ اے اردو کے امتحان کی جزوی تکمیل کے لیے مقالہ لکھا۔ بعد ازاں پی ایچ ڈی کے لیے "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" کے موضوع کو تحقیق کے لیے منتخب کرنا بھی ان کی اقدار شناس شخصیت کا مظہر تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم شعبہ درس و تدریس سے اپنی وابستگی پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس شعبے کو طلبا کی کردار سازی کا اہم ترین کام کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مادی و مالی منفعت کے حصول میں مصروف اساتذہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ "اقبال اور ارکان اسلام" کے عنوان کے تحت ایک خیال افروز

کتاب لکھ کر انھوں نے اپنے اصلاحی اور منصبی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا کار خیر کیا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ غبار ناقہ میں گم ہونے والے فلسفی گفتار کے شہید تو ہو سکتے ہیں کردار کے غازی نہیں بن سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ علم روح پرور ہو کر ہی اپنے فریضے سے سبک دوش ہو سکتا ہے۔ اگر یہ جسم نفس کے تقاضوں کے لیے حاصل کیا جاتا ہے تو اس کی دنیاوی اہمیت کے باوجود کرداری محرکوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم جانتے تھے کہ مرشدوں کے بغیر کردار سازی کا کام ممکن نہیں۔ انھوں نے یہ کتاب اپنے دادا مرشد حافظ کرم بخش چشتی صابری رحمتہ اللہ علیہ کے نام معنون کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> "میرے پیر و مرشد کو اس انداز سے نوازا کہ وہ والہ دیوان چند ہندو ساہوکار سے خواجہ محمد دیوان چشتی صابری رحمتہ اللہ بن کر کہکشان فقر کا ایک ستارہ بن گئے"۔ (۱۳)

استاد اور خصوصاً درد مند دل رکھنے والا استاد اپنے شاگردوں کو ایک مرشد کی مانند ہی علم و عمل کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔ مزید برآں اگر وہ تصنیف و تالیف کے سلسلے سے منسلک ہے تو اس کے اصلاحی خیالات تک ایک عالم کی رسائی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی صحبتوں اور تحریروں سے فیض یاب ہونے والے شاگرد اور قاری ان کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ ان کی درویشی اور صوفیانہ عادات کا چرچا ان کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ وہ ناقصوں اور کاملوں میں یکساں مقبول تھے۔ ناقص ان کی رہنمائی سے مستفیض ہوتے تھے اور کامل ان کے علم و عمل کی وسعت و عظمت پر مہر تصدیق ثبت کرتے تھے۔ صدق مقالی اور رزق حلال کے موضوعات پر ان کی گفتگو سے مستفید ہونے والے آج تک ان کی ذات پُر صفات اور ذہن رسا کی داد دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے جس زمانے میں شعور کی آنکھ کھولی وہ متحدہ ہندوستان کی غلامی کا زمانہ تھا۔ فرنگی سیاست زوروں پر تھی۔ مسلمان زوال آشنا تھے۔ مادی اور تکنیکی ترقی نے روحانی شمعوں کو سرد کر رکھا تھا۔ علت و معلول کی منطق دست برد سے بچنا کار محال تھا۔ دنیاوی عقل کے معاملات کو پذیرائی مل رہی تھی۔ ایمان اور عشق کے حوالے اہمیت کھو چکے تھے۔ آتش نمرود میں عشق کے کود جانے کے واقعات کو پارینہ قصے گردانا جا رہا تھا۔ تشکیکی منطق زوروں پر تھی۔ سرسید کے تتبع میں عقلیت پسندی کے راستے کو بنیادی اہمیت دی جا رہی تھی۔ نئے سائنسی علوم کے رسیا از بس ہر چیز کو تجربے کی کسوٹی پر پورا اتارنا چاہ رہے تھے۔ ایسے میں اس امر کی اشد ضرورت تھی کہ منطقی اور فکری دلائل اور سائنسی شعور کی روشنی میں ایمان

اور عقائد کے مسائل کی توجیہات کا رستہ اپنایا جائے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے نئے زمانے کے تناظر میں قدیم مذہبی عقائد کی تشریح و تعبیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ہرمینو ٹک کے جدید تصورات کے حوالے سے مذہبی متون اور شعری دانش کی عصری شرحوں سے سروکار رکھا۔ اس سلسلے میں کلام اقبال (فارسی) کی شرحوں پر مشتمل ان کی کتب اور اقبال اور مسئلہ وحدت الوجود لائق مطالعہ ہیں۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں ان کی غیر مطبوعہ کتاب "اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ مصطلحات" بھی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے اردو اور صوفیائے چشت کے حوالے سے بھی تحقیقی کام کیا ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی کتاب "اقبال اور ارکان اسلام" اقبالیات کے سلسلے میں ہونے والے تحقیقی اور توضیحی کاموں میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اقبال کے روحانی مرشد مولانا روم کی مثنوی کو پہلوی یا فارسی زبان میں لکھے گئے قرآن سے تعبیر کرنے کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ اس مثنوی کی معنویت اور قرآنی مطالب میں ہم آہنگی موجود ہے۔ اقبال بھی اس امر کا بالتکرار اظہار کرتے رہے ہیں کہ ان کے اپنے کلام میں بھی قرآن کی الوہی معنویت سے مکمل استفادہ کیا گیا ہے۔ قرآنی پیغامات انسان اور سماج دونوں کو روحانی اور مادی بالیدگی کی جانب لے جاتے ہیں۔ ان پر عمل کر کے دنیاوی معاشروں کو جنت نظیر بنایا جا سکتا ہے۔ ارکان اسلام کی سماجی اور روحانی افادیت کی روشنی میں کلام اقبال کا مطالعہ اسلام کی روح تک رسائی کی ایک پر خلوص کوشش ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ صدق مقالی اور نیک اعمالی کے در وا کر سکتا ہے۔ ارکان اسلام کو مانے بغیر کوئی شخص حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا۔ کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر مکمل اعتقاد ان کے ادب و احترام کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔ ان ارکان کا مقصود مسلمانوں کو ایک ملت کی حیثیت سے دنیا میں عروج و سرفرازی عطا کرتا ہے۔ باعمل مسلمان کی خودی اس کی انسانی عزت نفس کو ذلت و رسوائی سے بچاتی ہے۔ اس کا تصورِ توحید اسے کسی دنیاوی طاقت کے آگے جھکنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ ایک غیور انسان کی مانند ایسے فقر کا رستہ اختیار کرتا ہے کہ جس کا مقصود فنافی اللہ کی حقانیت کا ادراک و شعور ہے۔ مسلمان لا کی آندھیوں میں گم ہو کر دنیاوی عظمتوں سے فیض یاب ہونے کی بجائے الا اللہ کی منزل کی جانب گامزن ہو کر روحانی سرمایوں سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ارکان اسلام اور کلام اقبال میں ہم آہنگی تلاش کرتے ہوئے کئی ایسے دیگر بنیادی موضوعات کا بھی شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا ہے کہ جن کے بارے میں جاننا دائرہ اسلام

میں داخل ہونے والے افراد کے لیے امر لازم ہے۔ اسلام کیا ہے؟ دین کا مفہوم کیا ہے؟ ایمان کسے کہتے ہیں؟ مومن کی صفات کیا ہیں؟ اور مسلمان کون ہے وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے اسلام کے تناظر میں اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کی توضیحوں اور کلمہ طیبہ کی علمی، عملی اور صوفیانہ صورتوں کا ایک مفکر اور عالم کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے تصوف کی نظری اور فکری بصیرتوں کی روشنی میں تصور توحید کی متنوع جہتوں کی نشاندہی کی ہے۔ توحید، وحدۃ الوجود، شرک، حق و باطل، تسلیم و رضا، استمداد و غیر اللہ، ملکیت، جہاد، خودی، علم، اخوت و مساوات، فرقہ بندی، تقسیم شعوب و قبائل، وطنیت، صلح کل، خوف و حزن، فرد و جماعت، جون اور تن، عینیت، شریعت و طریقت، وحدت دین و دنیا، ضبط نفس، سیاست، استغنا، قوت، فطرت، خود انحصاری، قانون و جبر، اقتدار، خیر و شر، مسئلہ جبر و قدر، تقلید، پابندی آئین الٰہی، فقر و فقیری، ترک دنیا، فقر و سلطنت، عدل و احسان اور آزادی کے موضوعات کو کلام اقبال کے فلسفیانہ اور شاعرانہ حوالوں سے مزین کر کے پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم علامہ اقبال کی مانند عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والے کئی موضوعات کو نبوت و رسالت کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس حوالے سے نبی اور رسول کے معنی اور ان میں فرق، مفہوم نبوت و رسالت، جھوٹی نبوت، نبی اکرم ﷺ باعث و مقصود کائنات، ان کی نورانیت و بشریت، عبودیت و اطاعت، محبت و عشق، حیات النبی، ادب و احترام، محبت و احترام اہل بیت و صحابہ، مدینۃ الرسول کا احترام، غیب دانی، شفاعت، معراج، رحمت عالم و عالمیاں، نبی شاہد، نبی امی، فقر نبی، زیارت و سنت، معجزات، اسمائے رسول، توسل رسول اور شان رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسے موضوعات کو نہایت عقیدت و احترام سے زینت قلم بنایا گیا ہے۔ ان کی ادبی تحریریں لیفہ ان نظر کا نتیجہ ہیں انھیں کتب کی کرامت سے غرض نہیں ہے اس لیے استاد ان مکاتب کو اس میں اس عشق کو تلاش کرنا چاہیے کہ جس کی عدم موجودگی میں انسان کی حالت مردے سے بدتر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اپنی اقبال فہمی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"کرم صحبت بزرگان نے جہاں تک مجھے کلام اقبال کا فہم عطا کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی دور کے سوا ان کا سارا کلام قرآن و سنت کے پس منظر میں ہے۔ انھوں نے اپنے متعلق "غزل سرائم و پیغام آشنا گویم" کی جو بات کی ہے اس میں بھی اشارہ دیا ہے کہ

میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا منبع اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں ہے۔ اس کے سوا اگر کسی کو کلام اقبال میں کچھ اور نظر آتا ہے تو وہ اس کی اپنی فہم کا قصور ہے۔ جو شاعر خدا سے مخاطب ہو کر یہاں تک کہہ دے کہ اگر میں نے قرآن کے سوا کچھ اور کہا ہو "روز محشر خوار و رسوا کن مرا" اس کے کلام میں اس سے ہٹ کر کچھ اور ڈھونڈنا عبث ہے۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے اس دعویٰ کے پس منظر میں جب میں نے کلام اقبال کا نئے سرے سے مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے سارے دھاگے کو چاہے اس کا رنگ پکا (اصلی) ہو یا کچا (فروعی) ارکان اسلام کی کھونٹ کے گرد لپیٹا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر زیر نظر کتاب میں، میں یہ عمل کرتا تو علامہ کی ساری کتابوں کو ایک کتاب میں سمونا پڑتا جو کسی لحاظ سے بھی ممکن نہ تھا۔ اس لیے مجھے مختلف موضوعات کے لیے بنیادی اور نمائندہ اشعار کو ڈھونڈنا پڑا جو بذات خود باریک بینی کا کام تھا۔

یہ بات برصغیر کے مسلمانوں کا ایک قومی المیہ ہے کہ وہ انگریز غاصب کی ریشہ دوانیوں اور اس کے مسلمان گماشتوں کی سازشوں کی وجہ سے اپنے دین سے دور اور اپنے ثقافتی ورثے سے غافل ہو گئے۔ اس عمل بے دینی اختیاری اور گمراہی پسندی میں تیزی اس وقت آئی جب کمیونسٹ روس نے ترقی پسندی کی تحریک کے نام سے ایک سیاسی، ثقافتی اور ادبی محاذ کھول دیا اور اللہ والوں کی رہی سہی متاع دین و دانش اس کی کافر نگاہی نے لوٹ لی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دانش وروں نے مغرب زدہ ذہن کو سہلا کر روایت سے بغاوت کی ایک ایسی تحریک چلائی جس سے مسلمان اپنے شاندار ماضی، عظیم انسانی قدروں اور دینی و روحانی ورثہ سے غافل ہوتا چلا گیا اور اسے یہ بھی پتہ نہ رہا کہ وہ کس آسمان سے ٹوٹا ہوا تارا اور کس شجر ثمردار کی شاخ بریدہ ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اپنی روایت کی طرف لوٹنے والے مسلمان پر بنیاد پرستی کی پھبتی کسی جا رہی ہے اور اپنے ثقافتی، لسانی اور ادبی ورثہ کی بات کرنے والے کو قدامت پسند اور دقیانوسی کہا جا رہا ہے۔ ایک ہی ملک میں ایک سے زیادہ قومیتوں کے نعرہ کی آڑ میں علاقائی بولیوں کو مسلمانوں کی قومی زبان اردو اور ثقافتی زبان فارسی کے مقابلے میں لا کر ان زبانوں کو قربان کیا جا رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو کیا جا چکا ہے۔ یہی وہ شب خون ہے جسے نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا! اور آج پوری قوم علامہ اقبال کے اصل پیغام سے محض اس لیے نا واقف ہے کہ وہ فارسی سے نا بلد ہے۔ عربی نا آشنا ہے۔ اردو گریز ہے۔" (۱۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اور نفاذِ اردو کی تحریک: چند شذرات

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا، وہ "انجمن تحفظِ اردو" کے صدر تھے۔ یہ ان کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج پنجاب میں اُردو زبان و لازمی مضمون کے طور پر ایف۔ اے کے نصاب میں شامل ہے مگر نہ آج اس کی حیثیت ایک ثانوی زبان کی سی ہوتی۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے الف۔ د۔ نسیم نے انفرادی طور پر بھی کاوشیں کیں اور اجتماعی طور پر بھی مثلاً انھوں نے مختلف اخبارات میں اُردو کی لازمی حیثیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے بہت سے مضامین لکھے ذیل میں ان کے چند مضامین کا ایک جائزہ پیش ہے:

"انٹرمیڈیٹ کے لیے نئی تعلیمی نصابی سکیم"

(وفاقی وزارت تعلیم کے ماہرین کس جہت میں پیش رفت چاہتے ہیں؟)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا یہ مضمون روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲ نومبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

اس مضمون میں الف۔ د۔ نسیم نے اس نکتے کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے لیے جو نیا نصاب مقرر کیا گیا ہے اس میں اُردو کو ایک حقیر حیثیت سے نوازا گیا ہے اور ایک غیر زبان انگریزی کو لازمی درجہ دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے جو کہ ایک غلط روش ہے مثلاً انگریزی سے اپنے غیر ہمدردانہ جذبات کا اظہار، وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "۔۔ میں صرف اُردو ہندی کی بحث ہی پر توجہ مرکوز کرانا چاہتا ہوں تاکہ ہماری پر جوش مگر شاہی مزاج قوم کی سمجھ میں اس کے خطرناک مضمرات اچھی طرح آجائیں اس نصابی سکیم کا سب سے معنی خیز پہلو یہ ہے کہ اس میں ذریعہ تعلیم کا کچھ ذکر نہیں غالباً انگریزی ہی مدنظر ہے کیونکہ اگر اُردو کو ذریعہ تعلیم مدنظر ہوتا تو اس کا صاف اور برملا ذکر ہوتا یا پھر اُردو کے مضمون کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے کیا گیا ہے کیونکہ اس سکیم کے مطابق اب نہ اُردو مستقل مضمون ہے اور نہ علاقائی زبانیں مستقل رہیں گی اس لیے لامحالہ فتح انگریزی کی ہوئی۔"(۱۵)

اپنے ایک اور مضمون "انٹرمیڈیٹ کی نصابی سکیم اور اس کے لیے اصلاحی تجاویز" (شائع کردہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء) میں بھی الف۔ د۔ نسیم انٹرمیڈیٹ کی سطح پر جہاں نصابی سکیم کے لیے چند اصلاحات تجویز کرتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ اُردو کو اعلیٰ درجہ دینے پر زور دیتے ہوئے وہ

لکھتے ہیں کہ:

"اردو کی انگریزی پر برتری کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس کے ۲۰۰ نمبروں کی وجہ سے قائم رہ سکتی تھی یہ بات انگریزی پسند ذہنوں کو قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی حکومت سے مطالبہ ہے کہ اگر وہ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر انگریزی کو ختم نہیں کر سکتے تو کم از کم اردو کی ۲۰۰ نمبری برتر حیثیت بحال کر کے اس کے "حکمران زبان" ہونے کا ثبوت تو دے۔"(۱۶)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھ کر پورے ملک کے اساتذہ اور اربابِ فکر و دانش کو اپنے مطمحِ نظر سے آگاہ کیا اور انھیں اس بات پر اکسایا کہ وہ ان کے اردو کی حمایت میں دیے گئے دلائل کو سمجھتے ہوئے ان کا ساتھ دیں مثلاً روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۶ نومبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والے مضمون "قومی زبان، ناقدری میں اضافہ؟" میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ ہر پاکستانی خاص طور پر محبِ وطن اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کی بقا کا خیال کرتے ہوئے اس نئی تعلیمی سکیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں جو ہاتھ اردو کے گریبان تک پہنچ سکتا ہے اس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ اس کا تو تصور ہی بہت اذیت ناک ہے۔"(۱۷)

ان مضامین کے علاوہ الف۔ د۔ نسیم نے مختلف اخبارات میں مندرجہ ذیل مضامین لکھ کر عوام میں یہ شعور پیدا کیا کہ اردو زبان کا نصاب سے اخراج اور اس کی کم تری قوم کے لیے زہرِ قاتل کے مترادف ہے نیز اگر قومی زبان سے یہ سلوک ہو سکتا ہے تو آہستہ آہستہ اس برائی کی جڑیں ہمارے فکر اور سماجی نظام تک بھی پہنچ جائیں گی۔ ان مضامین کی تفصیل کچھ یوں ہے:

"ایک کمزور مقدمے کی پیروی!" (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۶ مئی ۱۹۸۱ء)

"نیا منصوبہ نصاب اور اردو" (روزنامہ جسارت کراچی، ۳۰ جنوری ۱۹۸۱ء)

"اردو کی مزید پذیرائی کے لیے ہدایت" (روزنامہ نوائے وقت ۱۷ نومبر ۱۹۸۰ء)

"نصابِ تعلیم کب تک تجربات کی زد میں رہے گا" (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲ نومبر ۱۹۸۰ء)

"نیا انٹرمیڈیٹ نصاب اور قومی زبان" (روزنامہ نوائے وقت لاہور نومبر ۱۹۸۱ء)

"نئی تعلیمی سکیم اور قومی زبان" (روزنامہ امروز، ۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء)

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ الف۔ د۔ نسیم نے مختلف رسائل و جرائد میں بھی اُردو کی برتری اور اولین لازمی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف عنوانات کے تحت مضامین لکھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

"نیا انٹرمیڈیٹ نصاب اور قومی زبان" (ماہنامہ نگار لاہور، اکتوبر ۱۹۸۰ء)

"انٹرمیڈیٹ کی نئی نصابی سکیم میں اُردو کی حیثیت سکیم پر دوبارہ غور ہونا چاہیے" (اسلامی جمہوریہ ۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

"انٹرمیڈیٹ نئی نصابی سکیم" (انجمن ترقی اُردو پمفلٹ مارچ ۱۹۸۱ء)

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ الف۔ د۔ نسیم نے حکومت، وزارت تعلیم کے نمائندوں، مختلف کالجوں کے اساتذہ، اور اہل زبان و ادب کو بھی مکاتیب کی تفصیل بھی پیش کی نیز عوام کو اس بات کا احساس بھی دلایا کہ اُردو کی زبان کی حیثیت ملک میں بولی جانے والی تمام زبانوں سے افضل و برتر ہونی چاہیے الف۔ د۔ نسیم کی دوررس نگاہ باقی لوگوں کی نسبت ایک جداگانہ زاویے سے سوچتی تھی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ڈھیروں اعتراضات اور مخالفتوں کی پروا کیے بغیر اپنے مشن کو جاری رکھا اور آخرکار ان کو اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ذیل میں ان خطوط کی تفصیل پیش ہے جو الف۔ د۔ نسیم نے مختلف حضرات کو لکھے ان خطوط کی نقول ساتھ ہی منسلک کی گئی ہیں۔

صدر مملکت، وزیر اعظم، چاروں صوبوں کے گورنر، جسٹس سپریم کورٹ، چاروں صوبوں کے اہم اور معروف روزناموں اور بعض ہفتہ وار، ماہوار اور سہ ماہی رسالوں کے مدیران، مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ، انجمن ترقی اُردو کراچی اور لاہور کے سربراہوں اور جملہ ریجنوں کے ڈائریکٹریٹ تعلیم اور شکایات سے متعلقہ محکمہ کے سربراہوں کے نام وغیرہ۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات پر سمیرا جہانگیر نے پروفیسر صابر لودھی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ برائے ایم اردو سپرد قلم کیا۔ یہ مقالہ جامعہ پنجاب، کے شعبہ اردو کے لیے ۱۹۹۳ء میں لکھا گیا۔ مقالہ نگار سمیرا جہانگیر نے ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم سے ذاتی ملاقات بھی کی اور ان سے ان کے شعر و ادب اور خاندانی زندگی کے حوالے سے متعدد سوال پوچھے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے ریفرنس مقالہ کا درجہ رکھتا ہے کہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے انھیں اپنی زندگی اور ادبی خدمات کے بارے میں براہ راست آگاہ کیا۔ سمیرا جہانگیر لکھتی ہیں:

"مجھے تحقیق کے لیے جو موضوع دیا گیا وہ "الف۔ د۔ نسیم کی ادبی خدمات" تھا

> یوں مجھ پر ایک دوہری ذمہ داری عائد کر دی گئی کہ ایک طرف تو مقالہ لکھنا ہے اور دوسری طرف ایک ایسی زندہ شخصیت پر تحقیق کرنے کی جسارت کرنا ہے جو بقول شاعر: آپ اپنے اندر جہانِ معنی ہے۔اور ادب کا کوئی بھی میدان اس شخصیت کی رسائی سے بالاتر تو نہیں ہے۔ تحقیق کس قدر مشکل اور "صبر آزما" کام ہے اس کا مجھے پہلے علم نہیں تھا لیکن شاید کسی کی اذیت کا اندازہ لگانے اور کرب کو محسوس کرنے کے لیے خود اذیت میں مبتلا ہونا ضروری ہے۔ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ اگر آج میں یہ مقالہ تحقیق تو شاید عمر بھر اس فن کی اہمیت سے واقف بھی نہ ہوتی"(۱۸)

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی سے "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بطور محقق اور نقاد" کے عنوان کے تحت ایم فل۔ اردو کے لیے ایک تحقیقی مقالہ سید عبدالوحید نے ۲۰۰۶ء میں سپردِ قلم کیا۔اس میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی تحقیقی بصیرتوں کو موضوعِ اظہار بنایا گیا تھا۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے کتاب "اردو میں اصولِ تحقیق" میں شمولہ مقالہ بعنوان "پاکستان میں اردو تحقیق" میں لکھا ہے:

> "خواجہ میر درد پر پاکستانی محققین نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔صرف ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے انھیں موضوع بنایا۔ ان کے دو مقالات "خواجہ میر درد کا خاندان"("اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۵۸ء) اور "خواجہ میر درد کے کلام میں تصوف کی تلاش"(ایضاً مئی ۱۹۵۹ء) قابلِ ذکر ہیں۔قائم چاند پوری پر ڈاکٹر اقتدا حسن کا کام وقیع ہے لیکن اس پر ان کا مفصل مطالعہ محض ان مقدمات تک رہا جو "کلیاتِ قائم" اور "مخزنِ نکات" پر انھوں نے لکھے۔اس کے حالات و واقعات پر ان کا علیحدہ مقالہ بزبان انگریزی ہے (اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۶۵ء) لیکن وہ مذکورہ مقدمات کے مطالب ہی کا احاطہ کرتا ہے۔"(۱۹)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے نئے موضوعات کا انتخاب کیا۔وہ ایسے موضوعات منتخب کرتے تھے جن کا کسی نہ کسی حوالے سے مذہب، تصوف یا فلسفہ تعلق ہوتا تھا۔ان کی شخصیت کا پرتو ان کے متون میں [illegible]

حد تک موجود ہے۔ وہ مذہب، کلاسیکی ادبی روایات، اور بزرگوں سے لگاؤ کو اپنی تنقید و تحقیق کی بنیاد بناتے تھے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ادب میں کلاسیکیت کے فروغ میں دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی تحقیق و تنقید میں مسلم مشرقی ادب کے معاییر کی جھلکیاں موجود ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے قارئین اردو زبان و ادب کی تاریخ سے اس انداز سے واقف ہوں کہ اعلیٰ انسانی اخلاقی قدریں ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکیں اور وہ اپنے تہذیبی اور ثقافتی سلسلوں کو اہمیت دیتے رہیں۔ انور شمیم دل نے اپنی انگریزی کتاب پاکستانی لنگوسٹکس میں انھیں ایک ماہر لسانیات کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے متون میں جا بجا اردو زبان و ادب کے بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کا کام کیا ہے۔ ایک جگہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اپنے تصورِ ادب کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "جس تحریر کو ادب کہا جاتا ہے خواہ وہ کسی زبان کا کیوں نہ ہو جب تک وہ زبان و بیان کے اعلیٰ پیمانوں، تخیل و فکر کی فلک بوس سربلندیوں اور مضامین و معانی کی پر جمال گہرائیوں کا حامل نہ ہو ادب نہیں کہلا سکتا جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں اس میں ہر شاعر اپنی بساط کے مطابق ان ادبی لوازمات کو نگاہ میں رکھنے اور ان پر پورا اترنے کی کوشش کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ آج ہم اس گروہ کے صف اول بلکہ صف دوم اور سوم کے شاعروں کو بھی عظیم شاعروں اور ان کے کلام کو کلاسیکی شاعری کا نام دیتے ہیں جو کل بھی زندہ تھی آج بھی زندہ اور آنے والے کل میں بھی زندہ رہے گی"۔ (۲۰)

حوالہ جات

۱۔ مولانا روم، دیوان شمس تبریز، غزل نمبر ۱۳۳۳، ادیب سائٹ گیر، تہران، ایران، ص ۲۲۳

۲۔ الف۔ د۔ نسیم، غزل مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج منٹگمری، س ن، ص ۳۱

۳۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، "شرح کلیات اقبال فارسی"، لاہور، شیخ بشیر احمد اینڈ سنز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۲۶

۴۔ الف۔ د۔ نسیم، "ساہیوال ڈویژن" (اول)، اوقاف پنجاب، محکمہ اطلاعات، سعادت سعید

۵۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، "انٹرویو"، روزنامہ "جنگ"، جریدہ ادب، ۱۳ اپریل ۱۹۹۳ء

۶۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، "انٹرویو"، روزنامہ "جنگ"، جریدہ ادب

۷۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، "انٹرویو"، روزنامہ "جنگ"، جریدہ ادب

باب سوم

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا علمی و ادبی سرمایہ

مطبوعہ ادبی کتب

۱۔ مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبالؒ

''مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبالؒ'' اقبالیات کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب بزم اقبال لاہور سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے کتاب کا انتساب عظیم وحدۃ الوجودی صوفی شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے نام کیا ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کا مصنف ادب اور تصوف دونوں موضوعات پر یکساں دسترس رکھتا ہے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''ماہرین اقبالیات میں اقبال کے وجودی تصورات میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ادب اور تصوف دونوں کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ لے کر کلام اقبال کے بعض گوشوں کو منور کیا ہے''(۱)

''مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال'' سات ابواب میں منقسم ہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ تصوف کیا ہے؟

۲۔ تصوف پر ترک دنیا اور رہبانیت کا بہتان

۳۔ وحدۃ الوجود کیا ہے؟

۴۔ وجود و شہود کا معاملہ

۵۔ وحدۃ الوجود کے متعلق مغالطے

۶۔ وحدۃ الوجود کے متعلق اقبالؒ کے افکار کا ارتقا

۷۔ اقبال کی مثنوی ''گلشن راز جدید'' اور مسئلہ وحدۃ الوجود

کتاب کا فاضل اقتباس خاصے کی چیز ہے۔اس میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ اسلامی تصوف پر ویدانت، رہبانیت اور نوفلاطونیت کے اثرات کی نفی کی ہے۔اس موضوع پر اردو میں اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> اس کتاب میں، میں نے تصوف، وحدۃ الوجود اور ان سے متعلق مسائل و معاملات کو زیادہ تر علامہ اقبال ہی کے خیالات وافکار سے واضح کیا ہے۔اس سلسلے میں دوسرے سیکڑوں بزرگوں کی تحریروں سے بھی تقویت حاصل کی جا سکتی تھی۔یہ طریقۂ کار محض اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ تصوف اور وحدۃ الوجود کا ذکر بھی ہوجائے اور علامہ اقبال کی اس سے رغبت، وابستگی اور عقیدت کا پتہ بھی چلتا رہے۔اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ علامہ کو تصوف اور وجود کا معترف، قائل بل کہ داعی ثابت کیا جائے۔اس لیے قارئین کرام اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کی تحریروں کے حوالوں کو اس میں تلاش کرنے کی زیادہ کوشش نہ کریں۔جب علامہ اقبال ہی ہمارے اس دعوٰی کی تصدیق کررہے ہوں کہ وہ تصوف اور وحدۃ الوجود کے معترف و قائل ہیں تو دوسروں کے بیانات کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے(۲)

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کے خیال میں اقبال کی ابتدائی تحریروں میں بزرگان دین سے عقیدت اور تصوف کی طرف فطری میلان دکھائی دیتا ہے۔ان کی فکر میں موجود الجھنیں یورپ میں قیام کے دنوں میں پیدا ہوئیں جب انھوں نے تصوف کو مغربی فلسفے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ان کا موقف ہے کہ تصوف اور اس کی متعلقات کو سمجھنے کے لیے اسلامی تصوف اور عجمی تصوف کی تفریق ضروری ہے۔ڈاکٹر حسن رضوی کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کی ایک کتاب "اقبال اور مسئلہ وحدۃ الوجود" بزم اقبال نے چھاپی ہے۔کیا آپ اقبال کو واقعی وحدۃ الوجودی سمجھتے ہیں؟ آپ کی اس کتاب پر ایک آدھ اختلافی تبصرہ بھی تو شائع ہوا ہے؟ الف۔د۔نسیم نے دو ٹوک انداز سے کہا:

"اختلاف تو نعمت ہے بشرطیکہ سلیقے اور تمیز کے دائرے میں رہ کر کیا جائے۔اس سلسلے میں اخلاقی گراوٹ اور ذہنی پستی کی گنجائش نہیں ہے۔میں نے اپنی اس کتاب میں پوری دلیلوں کے ساتھ یہ نکتہ

واضح کیا ہے کہ صوفیانہ وحدۃ الوجود کہ جس کے داعی ہمرشد اقبال، رومیؒ بھی تھے اور ابن عربیؒ بھی، اقبال
کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ فارسی زبان سے واقفیت یا کسی ایک جماعت سے وابستگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں
ہے کہ انھیں فکری، صوفیانہ اور مذہبی معاملات کا بھی کافی وشافی شعور ہے۔ ایسے لوگ ہاتھی کی دم کو پورا
ہاتھی سمجھ لیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ، فریدالدین عطارؒ، حافظ شیرازیؒ، محمود شبستریؒ، منصور حلاجؒ، بایزید
بسطامیؒ، شاہ ولی اللہؒ، خواجہ میر دردؒ کے وحدۃ الوجودی نظریات کے بھی منکر ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں
اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ اقبال ایسے وحدۃ الوجود کے قائل تھے جس میں عبد اور معبود دونوں کے
درمیان ایک فاصلہ قائم رہتا ہے۔ بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے۔ لیکن حل تو اس معاملے کو ہوتا ہے کہ یہ
کیسے ممکن ہوجاتا ہے کہ بندہ اپنی خودی کی معراج سے تقدیر بدلنے پر قادر ہوجاتا ہے (ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ
مومن کا ہاتھ)۔ میں نے لکھا ہے کہ اقبال نے اگر کسی بھی لمحہ پر تصوف اور صوفی کی مخالفت کی ہے تو اس
تصوف اور صوفی کی ہے جو آدمی کو ترک دنیا کا درس دیتا ہے اور ترک دین کا۔ یعنی وہ اس تصوف کے خلاف ہیں
جو عجمی روایات، ویدانتی خیالات اور افلاطونی افکار کا نتیجہ ہے۔ جو گمراہی و الحاد اور گمراہ درویشوں کی
وجہ سے رائج ہوا ہے۔ وہ اصل تصوف کو جس کے لیے انھوں نے فقر کا لفظ استعمال کیا ہے مسلمان قوم کا
سرمایہ حیات کہتے ہیں اور اس کا ترک کرنا اس کے زوال کا سبب قرار دیتے ہیں۔" (۳)

۲۔ نسیم طیبہ

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا اولین نعتیہ مجموعہ "نسیم طیبہ" کے عنوان سے منظر عام پر آیا، یہ مکتبہ عالیہ اردو
بازار لاہور سے ۱۹۹۳ء سے شائع ہوا۔ "نسیم طیبہ" میں نسیم صاحب نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے اسمائے گرامی کی تعداد کی نسبت سے اپنی ننانوے منتخب نعتیں شامل کی ہیں۔ ڈاکٹر نسیم مرحوم لکھتے ہیں
کہ "مجھے نہ تو شاعر ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ میں نعت گوئی جیسے نازک فن کے لیے اپنے آپ میں کوئی
اہلیت پاتا ہوں۔ میں نے اپنے خیالات و جذبات کو اس لیے موزوں کردیا ہے تاکہ میرا نام بھی رحمت
عالم و عالمیان ﷺ کے ثنا خوانوں کی فہرست میں شامل ہوجائے، چاہے کہیں حاشیے میں ہی سہی۔" (۴)

"نسیم طیبہ" میں شامل نعتوں کا عمومی مزاج کلاسیکی ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اس میں بڑی
خوب صورتی کے ساتھ بیان و بدیع کی فنی مہارتیں دکھائی ہیں۔ یہ "ورفعنا لک ذکرک" کے ارشاد عالیہ
کے تابع ابدی سچائیوں کی تلاش کا عمل ہے۔ قرآنی تلمیحات کے استعمال نے اس مجموعے کو مزید باثروت

بتادیا ہے۔ "نسیمِ طیبہ" کی نعت پرکیف روحانی کیفیات کی حامل ہے۔ ایک شعر دیکھیے:

جس انجمن میں ذکر شہ انبیا ﷺ نہیں
اس انجمن میں ہم تو ہیں لیکن خدا نہیں

"نسیم طیبہ" کا مختصر دیباچہ شاعر کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ اس میں بڑے انکسار کے ساتھ اس مجموعۂ نعت کو مغفرت کا وسیلہ بننے کی دعا کی گئی ہے۔

۳۔ خواجہ میر دردؒ (کتابیات)

یہ مختصری کتاب معروف شاعر خواجہ میر دردؒ کے فن اور شخصیت پر ہونے والے تحقیقی و تنقیدی کام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ چھتیس صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا تھا۔ مقتدرہ نے مشاہیر اردو کے تعارف کے لیے کتب کی اشاعت کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس نوعیت کی کتب کی اشاعت کا بنیادی مقصد ان اہل فکر کی جملہ خدمات کو اختصار کے ساتھ قارئین تک پہنچانا تھا۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ہے۔ ابتدا میں خواجہ میر درد کا مختصر سوانحی خاکہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کی تصانیف اسرار الصلوٰۃ (فارسی)، واردات (فارسی)، علم الکتاب (فارسی)، نالۂ درد (فارسی)، شمع محفل اور دردِ دل (فارسی)، آہ سرد (فارسی)، واقعات درد (فارسی)، رسالہ حرمت غنا (فارسی)، دیوان فارسی اور دیوان اردو کا مختصر تعارف درج ہے۔ مشفق خواجہ کی کتاب "جائزہ مخطوطات اردو" کے حوالے سے مختلف لائبریریوں میں موجود "دیوان درد" (اردو) کے بیس نسخوں کی فہرست دی گئی ہے۔ مطبوعہ نسخوں کی تفصیل بھی فراہم کی گئی ہے۔ کتاب میں درد شناسی کے حوالے سے:

ا۔ دیوان دردؒ کے مطبوعہ نسخوں کی تفصیل۔
ب۔ خواجہ میر دردؒ اور ان کے خاندان کے حوالے سے لکھی گئی کتابیں۔
پ۔ خواجہ میر دردؒ کی شخصیت اور فن پر تحریر کردہ جامعاتی مقالات کا تعارف۔
ج۔ وہ کتابیں جن میں خواجہ میر دردؒ اور ان کے خانوادے کا ضمنی تعارف ہے۔
د۔ اردو ادب کی وہ تواریخ جن میں خواجہ میر دردؒ کا تذکرہ موجود ہے۔
ہ۔ خواجہ میر دردؒ کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے تبصرے۔

و۔ معاصر رسائل و جرائد میں خواجہ میر دردؔ کی شخصیت اور فن پر شائع ہونے والے مضامین کی فہرست۔

ز۔ اردو کے قدیم شعری تذکروں کی فہرست جن میں خواجہ میر درد کا تعارف درج ہے۔ ان تذکروں کی تعداد چوہتر ہے۔

۴۔ اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی کتاب "اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا" مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے شائع کی تھی۔ اس کا سال اشاعت ۱۹۹۷ء ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو زبان کے ارتقا اور اس کی ترویج کے حوالے سے سلسلۂ چشتیہ کے باکمال بزرگوں کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ کتاب میں ساٹھ کے قریب نمایاں چشتی صوفیا کی علمی و مذہبی کاوشوں کو اجاگر تحقیقی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان بزرگان دین میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار (کعکی) کاکیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ، خواجہ علی احمد صابر کلیریؒ، شیخ صوفی بدھنؒ، شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتیؒ، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ، شیخ جمال الدین ہانسویؒ، امیر خسروؒ، شاہ بہرام فریدیؒ، شیخ لطیف الدین دریانوشؒ، شیخ سراج الدین عثمانؒ، شیخ علاؤ الدین علاء الحق بنگالی لاہوری پنڈویؒ، نور قطب عالم نور الحق پنڈویؒ، شیخ انوار الحق پنڈویؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مولانا مظفر بلخیؒ، خواجہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ، سید محمد یوسف المعروف بہ راجاؒ، امیر حسن سجزیؒ، خواجہ برہان الدین غریب، زین الدین خلد آبادیؒ، شیخ عین الدین گنج العلمؒ، سید محمد عبداللہ حسینیؒ، خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، سید اکبر حسینیؒ، شاہ میراں جی شمس العشاقؒ، شاہ برہان الدین جانمؒ، سید شاہ زندہ حسینیؒ، شاہ میران جی خدا نماؒ، شاہ امین الدین اعلیٰؒ، شاہ صدر الدینؒ، بابا شاہ حسینی المعروف بہ پیر پادشاہؒ، سید شاہ روح جو قتالؒ، شاہ حسن عرفؒ، شاہ میراں یعقوبؒ، شاہ حسینی حسنیؒ، شیخ احمد کھٹوؒ، شیخ قطب عالمؒ، شیخ شاہ عالمؒ، شیخ بہاء الدین باجنؒ، قاضی محمود دریائیؒ، شاہ علی محمد جیو گام دھنیؒ، شیخ خوب محمد چشتیؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، خاتم الذاکرین شیخ بہاء الدین برناویؒ، شیخ محبوب عالم عرف شیخ جیونؒ، شیخ علی متقیؒ، شیخ رزق اللہؒ، شیخ حسین صوفی چشتیؒ، خواجہ محمد چشتیؒ، مولانا محمد ابراہیم خوشدلؒ، شیخ علی سواؒ، شیخ دانیال چشتیؒ، سید میراں بھیک چشتیؒ، شیخ جنید موہانی چشتیؒ، شیخ احمد میرواتیؒ اور شیخ جمالیؒ کے بارے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔

کتاب میں ضمیمے کے طور پر ملک محمد امین کمال، عبدالملک بہروچی، عابد شاہ، معظم، شاہ عبدالقادر قادر، عبدل، سلطان ابوالحسن تانا شاہ، مشتاق، لطفی، حسینی، خواجہ رحمت اللہ رحمت، صوفی شاہ کاظم اور شاہ عشق اللہ عاشق کا ذکر ملتا ہے۔

برِصغیر میں اسلام کی اشاعت میں بزرگانِ چشت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، انھوں نے جس انداز میں ہندوستان میں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پھیلایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان بزرگانِ دین کے لیے برصغیر کی اجنبی فضا میں توحید کا پیغام پہنچانا آسان نہ تھا لیکن یہ ان مشکلات سے بہ آسانی گزر گئے، انھوں نے اپنی خیالات کی ترویج کے لیے عوام الناس کی زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ کتاب میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا تحریر کردہ مفصل دیباچہ بھی موجود ہے جو کتاب کے مندرجات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی یہ بات خاص غور طلب ہے:

> کسی مذہب، مسلک یا تحریک کی اشاعت اور اس کے نظریات و اصول کے دوسروں تک ابلاغ کے لیے اس کے سرپرستوں اور کارکنوں کو ایسی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کو ان کے مخاطب آسانی سے سمجھ سکیں ورنہ قوتِ گویائی و شنوائی کے باوجود مبلغین کی حیثیت گونگوں اور سامعین کی حالت بہروں کی سی ہوگی۔ قرآن کریم کے عربی زبان میں نازل ہونے کا سبب بھی یہی تھا کہ اس کے ابتدائی مخاطب عرب تھے۔ اگر پیغامِ ربانی کی زبان کی بجائے کوئی اور ہوتی تو یہ خداوند کریم کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوتا۔ یہی صورت برصغیر میں پیش آئی ہے۔ ہمارے ابتدائی صوفیائے چشت یا ان کے خلفاء نے جو صرف عربی اور فارسی پڑھے ہوئے تھے، جب تک اپنے علاقے کے مخاطبین کی زبان سے واقفیت پیدا نہیں کر لی ہوگی مقامی لوگوں تک اسلام اور اس کے اصولوں کا ابلاغ نہیں کر سکے ہوں گے (۵)

یہ کتاب ایک سو ترانوے صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں تاریخ لسان و ادب کو احسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں صوفیائے چشت کو اردو زبان و ادب کے بنیاد گزاروں میں شامل کیا گیا ہے۔ مصنف نے کہیں بھی معروضیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کتاب میں اردو زبان کے سادہ اور مشکل دونوں طرح کے نمونے موجود ہیں۔

۵۔ بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی کتاب "بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے "برصغیر میں چشت اہل بہشت کے سردار خواجہ معین الدین چشتی اجمیری" کے نام کیا ہے۔ اس کتاب میں اردو شعر وادب کی بنیاد رکھنے والے شعرا وادبا کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ اس عہد کی منتشر الخیالی اور معاشرتی ابتری کے بارے میں کہیں پر بھی الف۔ د۔ نسیم نے معجوب انداز اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے اس دور کے رطب ویابس کو بلا کم وکاست بیان کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> جن قلندر وضع، رند مشرب، آزاد منش اور غزل گو شعرا کا ذکر اب تک آچکا ہے۔ یہ پایہ شاعری سے کتنے گرے ہوئے کیوں نہ ہوں، انھیں آج ہم بازاری، سوقیانہ اور غیر ثقہ کیوں نہ کہیں، لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں ان کی ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ریختہ کی مٹھاس سے لوگوں کو اس آشنا کیا کہ اس کی موجودگی میں وہ فارسی کو بھول گئے۔ (۹)

اردو شاعری کے اس زریں دور میں (جو سیاسی لحاظ سے ابتری کا زمانہ ہے) زندگی کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ بدامنی اور انتشار کے باعث چند گھڑیوں کے لیے ہنس بول لینا بھی غنیمت تھا۔ حالات کے ستائے لوگ ان مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرتے تھے۔ الف۔ د۔ نسیم نے اس کتاب میں بڑی خوب صورتی سے اس عہد کی چلتی پھرتی لفظی تصویریں بنائی ہیں۔ اس کتاب میں اہل فن کی مجلسی زندگی کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری خود کو اس ماحول میں موجود تصور کرتا ہے:

> یہ قہقہے اور چہچہے لکھنؤ کے ہوں یا دہلی کے ایک بات واضح ہے کہ ان کی مسکراہٹیں دہلی میں بھی تھیں۔ اہل دہلی کے حالات کی تلخی کو ظرافت ومزاح کے قند نے ہلکا کر رکھا تھا ورنہ حادثات کی تیز وتند ہواؤں میں چراغ زیست کو زندہ رکھنا ناممکن تھا۔ جب یہ مخالف کا مقابلہ کرتے کرتے کشتی حیات کے سارے بادبان پارہ پارہ ہو جاتے ہیں، مزاح کے چپو ساحل سکون تک پہنچاتے ہیں۔ یہ غم کے مقابلے کا وہ آخری اور سہل ہتھیار ہے جس کو اہل دہلی نے وسیع پیمانے پر استعمال

کیا۔اس زمانے کے تذکروں سے شاعروں کے حالات پڑھ کر بعض اوقات
تعجب ہوتا ہے کہ سیاسی ناہمواری اور اقتصادی پریشانی کے اس تاریک دور
میں مزاح کے چراغ کیسے فروزاں ہیں۔(۷)

اس کتاب کے اٹھارہ ابواب ہیں جن کی فہرست کچھ یوں ہے:

۱۔فارسی سے اردو کی طرف لسانی سفر
۲۔اردو شاعری کا ہراول دستہ
۳۔شعر گوئی کے متنوع اور متفرق موضوعات
۴۔تخلصوں کی رنگارنگی اور ان کے عوامل
۵۔شاعر بننے کے شوق میں مختلف طریقوں اور حربوں کا استعمال
۶۔دلی کی زبان اور شاعری کی مقبولیت عام اور اس کے اثرات
۷۔دلی میں ہر جگہ شعر و شاعری کے چرچے
۸۔اردو شاعری اور شاعر: امرا کے زیر اثر
۹۔دلی میں علم و فضل کی عمومیت اور اردو شاعری پر اس کا اثر
۱۰۔دہلوی شاعری کا درویشی پس منظر
۱۱۔سماع اور موسیقی کا اردو زبان و شعر کی ترویج میں حصہ
۱۲۔طوائف الملوکی کا اثر: اردو زبان اور شاعری پر
۱۳۔دلی کی تہذیب اور ثقافتی قدریں اور ان کا اثر اردو زبان و شعر پر
۱۴۔اصلاح زبان کا دور
۱۵۔دلی میں اردو مشاعروں کا رواج
۱۶۔استادی و شاگردی کی روایت
۱۷۔اردو شاعری اور اس کی اصناف پر ہندی اور فارسی کے اثرات
۱۸۔اردو شاعری میں تذکرے لکھنے کا رواج

اس کتاب کے تین سو چھیالیس صفحات ہیں۔بارہویں صدی ہجری کے دلی میں اردو زبان
و ادب کی تحریک کے محرکات اور اس دور میں خواص و عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفہیم کے لیے یہ

کتاب نہایت اہم ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں بنیادی حوالہ جات سے رجوع کیا ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے دلی میں موجود اردو اور فارسی السنہ کی ثقافت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اس میں اردو زبان کی ترقی بھی ان کے پیش نظر رہی۔ ایک لسانی مورخ کے طور انھوں نے دلی میں اردو زبان کی ترقی کے متنوع پہلوؤں کو تذکروں کی مدد سے بھرپور انداز سے پیش کیا ہے۔ اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے انھوں نے اس میں سے تاریخ نویسی کے خشک "اس کتاب میں بعض مقامات پر دلچسپی پیدا کرنے کے لیے محمد حسین آزاد کے تتبع میں تخیلاتی فقرہ سازیوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے جدید و قدیم کے تقابلی مباحث سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے قصہ ہائے قدیم و جدید کو اپنے تنقیدی زاویوں کے مطابق پرکھا ہے۔ کلاسیکی اور جدید ادب کا موازنہ نہیں پسند تھا۔ بعض موضوعات پر ان کے تبصرے ان کی تحقیقی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں یہ درست ہے کہ انھوں تذکروں کو بنیادی ماخذ کے طور بخوبی استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود تذکروں کے قلمی نسخے ان کے تحقیقی مواد کی بنیاد بنے۔ انھی تذکروں کی مدد سے انھوں نے بارہویں صدی ہجری کی دلی کے شاعرانہ ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔

۶۔ شرح کلیات اقبالؒ (فارسی و اردو)

علامہ اقبالؒ کے افکار عالیہ کا اظہار فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں موجود ہے۔ ان کا فارسی زبان و ادب سے شغف اور انہماک اس قدر زیادہ تھا کہ ان کی فارسی شاعری کیفیت و کمیت کے لحاظ سے ان کی اردو شاعری پر حاوی ہے۔ یہ شاعری نوائے فردا ہے اور اس کا شاعر شاعر فردا کہلاتا ہے۔ اقبالؒ کے حین حیات ہی میں ان کی فارسی شاعری کے ترجمے اور تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فارسی کا چلن کم ہونے کی وجہ سے اقبالؒ کے "کلیات فارسی" کی تفہیم اور بھی ضروری تھی۔ یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر محمد باقر، غلام آقائے رازی، رشیدہ فاضل، ڈاکٹر عارف بٹالوی اور نشتر جالندھری نے اس روایت کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اقبالؒ کے فارسی کلیات کے ترجمہ و تشریح کا فریضہ اپنے ذمے لیا۔ یہ کلیات نو سو صفحات پر مشتمل ہے اور اسے شیخ بشیر احمد پبلشرز نے لاہور سے شائع کیا۔ اس شرح میں عام طور پر سادہ اور دل کش اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

کلام اقبال کے دیگر شارحین کی طرح علامہ اقبالؒ کے کلام کی یہ شرح بھی ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے

ذاتی علمی میلان کا سبب ہے۔ اس میں کسی بھی حکومتی ادارے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ڈاکٹر نسیم کو ہمیشہ اس بات کا قلق رہا کہ حکومتی سطح پر فکر اقبال کے فروغ کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم مرحوم کو اس شرح کے حوالے سے متعلقہ پرائیویٹ پبلشر سے سخت شکوہ رہا۔ ان کے خیال میں پبلشر نے ان سے یہ شرح لکھوا کر طے شدہ اعزازیہ بھی نہ دیا بلکہ کتاب کا اشاعتی معیار بھی مناسب نہ تھا۔ اس طرح کے تکلیف دہ تجربات کا وہ نجی محفلوں میں ذکر کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے "شرح کلیات اقبال" میں علامہ جیسے دانائے راز اور عارف کے فکری پیغام کو قاری تک احسن انداز میں پہنچایا ہے۔ اکثر شارحین اقبال کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ عام فہم یا فلسفیانہ انداز میں کلام اقبال کا ترجمہ اور شرح کر دیتے ہیں لیکن الف۔ د۔ نسیم صاحب نے شعوری طور پر یہ کوشش بھی کی ہے کہ یہ تشریح ہر سطح کے قاری کی علمی تشفی کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں فکر اقبال کو سمجھنے کا ذوق بیدار کرے۔ یہاں اس بات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

> ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے مطالب کو معلومات افزا بنانے کے لیے غیر معمولی تحقیق اور تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔ انھوں نے جہاں محسوس کیا ہے لفظی کی بجائے استدلالی انداز کو چنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ محققانہ انداز دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے مندرجات کے ہر پہلو کو جامع بنانے کے لیے بنیادی ماخذات پر بھروسا کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا کمال تھا کہ انھوں نے وسعت نظر سے کام لیتے ہوئے کلام اقبال کی تشریح و توضیح کرنے اور عمل کے دوران میں پیش آنے والی مشکلات کو حل کرنے کی مشکل ذمہ داری بھی اٹھائی ہے۔ (۸)

ملک بشیر اینڈ سنز نے الف۔ د۔ نسیم کی بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی شرحیں بھی شائع کی تھیں۔

۷۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (بطور شریک مصنف)

پنجاب یونیورسٹی لاہور نے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کے عنوان سے سولہ جلدوں میں ایک ادبی تاریخ لکھوانے کا شاندار منصوبہ باندھا تھا۔ اس عظیم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک سات رکنی کمیٹی وضع کی گئی، جس کے سربراہ پروفیسر علاؤالدین صدیقی تھے۔ ان کے ہم راہ

گروپ کیپٹن فیاض محمود مدیر عمومی مقرر کیے گئے۔ اس کتابی سلسلے میں اردو زبان و ادب کے سیکشن کے لیے پانچ جلدیں مختص کی گئیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی اس عظیم منصوبے کے سینئر ارکان میں شامل تھے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی اس عظیم منصوبے کے شریک مدیران میں شامل تھے۔ اس منصوبے میں اردو ادب کی تاریخ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان حصے کے اشاریے ایک الگ جلد میں شامل کیے گئے ہیں۔ زمانی اعتبار سے اس کام کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ چھٹی جلد ۱۷۱۲ء سے ۱۷۰۷ء
۲۔ ساتویں جلد ۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۳ء
۳۔ آٹھویں جلد ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء
۴۔ نویں جلد ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء
۵۔ دسویں جلد ۱۹۱۴ء سے ۱۹۷۲ء

اس تاریخ ادب کے اہم منصوبے کے دیگر مصنفین میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر عبیداللہ خان، ڈاکٹر سہیل احمد خان وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ان مصنفین میں نمایاں ہیں۔

۸۔ موجِ نسیم (خودنوشت سوانح عمری)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اپنی خودنوشت سوانح عمری "موجِ نسیم" کے عنوان سے لکھی۔ یہ تحریر انھوں نے بطور خاص گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ادبی مجلے "ساہیوال" کی خاص اشاعت (گولڈن جوبلی نمبر) کے لیے کالج کے منتظمین کی فرمائش پر لکھی۔ یہ باریک ٹائپ میں ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو بڑی سادگی اور انکسار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ ایک درویش کی آپ بیتی ہے جس کی زندگی مسلسل جہد و جہد سے عبارت ہے۔ ایک ایسا ایمان دار استاد جو ملازمت کے آخری دن بھی اپنی کلاسیں پڑھا کر، کالج کی عمارت کو الوداعی سلام کر کے گھر لوٹتا ہے۔ مصنف نے اس تحریر میں اپنی پیدائش سے لے کر پچاسی سال تک کے واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب اگر حواشی و تعلیقات کے ساتھ دوبارہ شائع ہو جائے تو یہ اہل نظر کے لیے ایک "مژدۂ طرب" ہوگا۔

زیر طبع ادبی کتب

۹۔ ارکان اسلام: کلام اقبال کے آئینے میں

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی کتاب "اقبال اور ارکان اسلام" کا انتساب ان کے دادا مرشد حافظ کرم بخش چشتی صابری رحمتہ اللہ علیہ کے نام ہے۔ انھوں نے درج کیا ہے کہ "اللہ نے میرے پیرو مرشد کو اس انداز سے نوازا کہ وہ لالہ دیوان چند بند داسا ہوکار سے خواجہ محمد دیوان چشتی صابری رحمتہ اللہ بن کر کہکشاں فقر کا ایک ستارہ بن گئے"۔

"اقبال اور ارکان اسلام" نسیم صاحب مرحوم کی علامہ اقبال کی شخصیت اور فن کے ساتھ قلبی و روحانی وابستگی کا ثمر اور ان کے مطالعات اقبال کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب میں اسلام کے بنیادی ارکان کی کلام اقبال کی روشنی میں تعبیر و تشریح کی گئی ہے۔ اسلام کے ارکان کو بہ سرو چشم تسلیم کیے بغیر مسلمان ہونا ممکن نہیں۔ دراصل ان پر عمل سماجی طور پر انسانی زندگی میں انقلابات برپا کرسکتا ہے بلکہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ پر عمل اعتقاداً ایک عظیم ملت کی تشکیل کی بنیاد ہے۔ کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ارکان اسلام اور کلام اقبال میں ہم آہنگی تلاش کرتے ہوئے کئی ایسے دیگر بنیادی موضوعات کا بھی شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا ہے کہ جن کے بارے میں جاننا دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے افراد کے لیے امر لازم ہے۔ اسلام کیا ہے؟ دین کا مفہوم کیا ہے؟ ایمان کسے کہتے ہیں؟ مومن کی صفات کیا ہیں؟ اور مسلمان کون ہے وغیرہ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے تناظر میں اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کی توضیحوں اور کلمہ طیبہ کی علمی، عملی اور صوفیانہ صورتوں کا ایک مفکر اور عالم کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے تصوف کی نظری اور فکری بصیرتوں کی روشنی میں تصور توحید کی متنوع جہتوں کی نشاندہی کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں توحید، وحدۃ الوجود، شرک، حق و باطل، تسلیم و رضا، استمداد غیر اللہ، ملکیت، جہاد، خودی، علم، اخوت و مساوات، فرقہ بندی،

تقسیم شعوب و قبائل، وطنیت، صلح کل، خوف و حزن، فرد و جماعت، جان و تن، عینیت، شریعت و طریقت، وحدت دین و دنیا، ضبط نفس، سیاست، استغنا، قوت، فطرت، خود انحصاری، فنون و ہنر، اقدار خیر و شر، مسئلہ جبر و قدر، تقلید، پابندی آئین الٰہی، فقر و فقیری، ترک دنیا، فقر و سلطنت، عدل و احسان اور آزادی کے موضوعات کو کلام اقبال کے فلسفیانہ اور شاعرانہ حوالوں سے مزین کر کے پیش کیا گیا ہے۔(۹)

۱۰۔ نسیم رحمت

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی نعتیہ شاعری کا دوسرا مجموعہ "نسیم رحمت" تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا مسودہ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر سعادت سعید کی ملکیت ہے۔ نمونے کے طور پر اس نعتیہ مجموعے میں سے ایک نعت شریف یہاں شامل کی جا رہی ہے:

تمھارا در تو بنا ہے فقط عطا کے لیے
مری طرف بھی نظر یا نبی خدا کے لیے
سیاہی حوروں نے زلفیں نچوڑ کر بھیجی
اٹھایا میں نے قلم جب تری ثنا کے لیے
ازل ابد ہیں تیرے نقش پا کے دو گلشن
تو ابتدا کے لیے ہے تو انتہا کے لیے
پڑھا کے اقرا سمیٹے ہیں جبرئیل نے پر
کھلے ہوئے تھے فقط یہ در حرا کے لیے
یہ اور بات ہے تو لب کشا نہیں ہوتا
رضائے حق تو ہے ورنہ تری رضا کے لیے
سوال کرنے سے پہلے مراد اس کو ملی
ہے ناز اس سے بڑا کیا ترے گدا کے لیے

۱۱۔ مکاتیبِ تسیم

انسانی جذبات و خیالات کے لطیف اظہار کی ایک صورت مکتوب نگاری بھی ہے۔ باہمی رابطوں کے لیے خط انسان کی سماجی ضرورت بھی ہے۔ خط لکھنا ایک مشکل فن ہے۔ تسیم صاحب نے اپنی زندگی میں ہزاروں خط لکھے، ان میں نجی اور غیر نجی خطوط شامل تھے۔ ان خطوط کا تحقیقی حصہ ڈاکٹر صاحب کے وہ مکتوبات ہیں جو ارباب حکومت کو لکھے گئے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ تسیم کے ان مکتوبات کا مجموعہ "مکاتیب تسیم" کے عنوان سے زیر طبع ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ تسیم ان خطوط میں مشرقی تہذیب کے دفاع اور مسلم طرزِ حیات کے فروغ کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ انجمن تحفظ اردو کے صدر کی حیثیت وہ صدرِ پاکستان اور مختلف محکموں کے وزرا کے نام لکھے گئے۔ ان خطوط کا موضوع عالم اسلام کے عمومی مسائل، حکومتی ایوانوں میں اردو زبان کی بے توقیری، خواتین کی الگ یونیورسٹیوں کی ضرورت، نوجوان نسل کی اخلاقیات کو بگاڑنے والے ٹی وی پروگراموں کی نشاندہی شامل ہے۔ ڈاکٹر تسیم قومی اسمبلی کے اراکین کے نام تحریر کردہ خطوط میں نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی جنگ بھی لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

فلسطین پر یہودیوں کے قبضے کو جائز قرار دینے والے ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ وہ دو ہزار سال تک یروشلم پہنچنے کے لیے سرگرداں رہے، اس سرزمین سے ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ قومی اسمبلی کے ارکان کو لکھے جانے والے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب اس موقف کو دلائل کی روشنی میں غلط ثابت کرتے ہیں۔ اس دلیل کے رد میں وہ علامہ اقبال کا ایک شعر درج کرتے ہیں:

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ کیوں حق نہیں اہل عرب کا

۱۲۔ اردو شاعری میں مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات

ڈاکٹر الف۔ د۔ تسیم کی ایک غیر مطبوعہ کتاب "اردو شاعری میں مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات اور اصطلاحات کا تفصیلی تعارف کروایا ہے۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات کے حوالے سے کتابیں تو موجود ہیں لیکن تلمیحات کے ساتھ اصطلاحات وغیرہ کو پہلی دفعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ہماری اردو شاعری میں استعمال ہونے والی تلمیحات میں کثیر تعداد قرآن مجید سے لی گئی ہیں۔

تلمیح کا تعلق بنیادی طور پر علم بدیع سے ہے۔ کسی تاریخی واقعے، شہر، مقام اور شخصیات کے مابین عامیانہ و متداول شکل کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کرنا تلمیح ہے۔ اردو ادب میں یہ ہمیشہ سے ایک مقبول صنف رہی ہے۔ تلمیح کے ذریعے اشاروں کنایوں میں بڑے وسیع تناظر میں موضوع کو ایک یا دو لفظوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ ہمارے شعرا نے اسلامی تصوف سے متعلقہ تلمیحات کا مناسب اور برمحل استعمال کیا ہے۔ تلمیحات کے ساتھ اس کتاب کو یہ تخصص بھی حاصل ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس میں اصطلاحات و واقعات کا تفصیلی تذکرہ بھی کیا ہے۔ صابری نور مصطفیٰ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

> مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر نسیم کی یہ تحقیقی اور تنقیدی کاوش ناقابل فراموش اور گراں قدر ہے۔ ان کی کتاب "اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات اور مصطلحات" اس تناظر میں بھی انتہائی اہمیت و انفرادیت کی حامل ہے کہ ہماری اردو شاعری میں مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات اور مصطلحات استعمال ہوئی ہیں۔ وہ درحقیقت قرآن مجید کے اسی فلسفہ اور رجحان کو پیش کرتی ہے جو ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے اور دوسرا سرچشمہ ہدایت بھی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلامی تعلیمات مرحلہ وار نازل ہوتی رہیں اور اسلام اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا تکمیل کو پہنچا۔ (۱۰)

سید عبدالوحید اس کتاب کی انفرادیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات" اس موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب اپنے اندر دنیائے ادب میں مستعمل مذہبی و صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات کا ایک جہان دیگر سمیٹے ہوئے ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک انبیاء و پیغمبران سے متعلق تلمیحات اور صحابہ، اولیاء کرام اور آیات و احادیث سے متعلقہ تلمیحات کا وسیع ذخیرہ شامل ہے۔ گویا یہ تصنیف گنجینۂ تلمیحات و مصطلحات کا ایک طلسم ہے۔ جس میں محقق کا شعر و ادب، قرآن و اسلام اور مذہب و تصوف

کے بارے میں مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اور مواد کی تنظیم و ترتیب بھی اعلیٰ درجے کی ہے(۱۱)

کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے انبیائے کرام (حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی زندگی کے واقعات اور قرآن کریم میں ارشاد کیے جانے والے غیر انبیا کے قصوں کے لیے استعمال کی جانے والی تلمیحات کا تعارف دیا گیا ہے ہیں۔ کتاب کے آخر میں صوفیانہ اصطلاحات کا تفصیلی ذکر ہے۔

۱۳۔ تذکرۂ نالۂ زار

یہ کتاب مرثیہ کی صنف کا عمدہ انداز میں تعارف پیش کرتی ہے۔ ہمارے ہاں اس صنف پر خاصا تنقیدی و تحقیقی کام ہوا ہے۔ ابتدائی طور پر ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا عنوان "اردو کے چند مرثیہ نگار" رکھا تھا، کہیں کہیں فہرستوں میں یہ نام درج ملتا ہے۔ چوں کہ ان مرثیہ نگاروں کی تخلیق کا میدان شہدائے کربلا جیسی مقدس و مطاہر ہستیاں ہیں، اسی نسبت سے مصنف نے بعد میں اس کا عنوان "تذکرۂ نالۂ زار" تجویز کیا۔ اس کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں معروف مرثیہ نگاروں کے تعارف کے علاوہ ان شعرا کا تذکرہ بھی آیا ہے جو ہمارے شعور و ادراک میں کہیں طاقِ نسیاں پہ دھرے ہیں۔ بہت سے اہم مرثیہ گو اس کتاب میں شامل نہیں ہو سکے ہوں گے لیکن کثیر تعداد کا ذکر آ گیا ہے۔

مرثیہ سے مراد "رونا" یا "نالہ و شیون کرنا" ہے۔ شہدائے کربلا کے رنج و غم میں اشک بہانا، یہی عمومی طور پر ہمارے شعرا کا انداز سخن رہا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے خیال میں اگر کسی دوسری صنف ادب میں ان ہستیوں کی بارگاہ میں تحسین کی گئی ہے تو اس کو اور اس کے دیگر پہلوؤں کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔ اس کتاب میں انھوں نے ایسی رباعیات اور منقبتیں لکھنے والے شعرائے کرام کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ "تذکرۂ نالۂ زار" صرف واقعہ کربلا کے شہدا کے مراثی کو موضوع بناتی ہے۔

۱۴۔ خواجہ میر دردؔ: حیات و فن / خواجہ میر دردؔ کا تصوف

یہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ موضوع ڈاکٹر صاحب کے صوفیانہ مزاج سے مناسبت رکھتا تھا، اس لیے ایم اے اردو کے دوران انھوں نے خواجہ میر دردؔ جیسی اپنے عہد کی

نابغہ روزگار شخصیت کو منتخب کیا، انھوں نے خواجہ میر دردؒ سے اپنی محبت اور عقیدت کا حق ادا کیا۔ یہ مقالہ بڑی دقت نظر کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ خواجہ میر دردؒ کے حالات و واقعات پر یہ اولین تحقیق ہے۔ ایم اے کی سطح پر اس قدر جان دار اور وقیع مقالہ تحریر کرنا آسان نہ تھا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اس مقالے کو پانچ ابواب (مقدمہ، میر درد کا زمانہ، میر درد کی زندگی کے حالات اور صوفیانہ ترتیب، میر درد کی شاعری میں صوفیانہ عناصر اور تصوف کے عمومی مباحث اور مسائل) میں تقسیم کیا ہے۔ اس مقالے کا مقدمہ بہ ذات ان کی علمیت پر دال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ اٹھارویں صدی عیسوی کے صوفیانہ رجحانات کی روشنی میں خواجہ میر درد کے شعری افکار کا جائزہ لیا ہے۔ اس مقالے میں موضوعہ شخصیت کی شاعری کے ساتھ نثری کتب سے اخذ و استفادہ بھی کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کی اشاعت عمل میں نہیں آسکی۔

۱۵۔ نسیم غزل:

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کلاسیکی انداز کی غزل کہتے تھے۔ ان کا کلام ملک کے معروف ادبی رسائل و جرائد میں تواتر سے شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنا مجموعہ غزل "نسیم غزل" کے عنوان سے ترتیب دے لیا تھا۔ ایک قومی روزنامے کو دیے گئے انٹرویو میں انھوں نے باقاعدہ مجموعے کے زیر طبع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ "نسیم غزل" میں ڈاکٹر صاحب کی اردو اور فارسی غزلیں شامل ہیں۔ ان کی غزل میں وحدۃ الوجودی افکار کا پرتو نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک اردو غزل یہاں نمونے کے طور پر پیش کی جا رہی ہے:

جلوۂ یار عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ہر جگہ اُس کا نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کعبہ و دیر میں بے کار کیا اُس کو تلاش
وہ مری روح و رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کہیں tقوس کے سینے میں تھا فریاد کناں
کہیں آواز اذاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کہیں توحید کے پردے میں تھا بے tام و نشاں
کہیں تصویرِ بتاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

تھا کہیں سلسلۂ کوہ و جبل میں ساکت
کہیں دریائے رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
بزم میں ساقیِ گلفام کی وہ تھا مژگاں
رزم میں نوکِ سناں تھا مجھے معلوم نہ تھا
خندۂ گل تھا کہیں اور کہیں موجِ نسیم
کہیں بلبل کی فغاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

"تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کے مصداق ڈاکٹر نسیم کی غزل میں صوفیانہ مضامین کو خوب صورت انداز سے برتا ہے۔ ان کے شعری لب و لہجے پر کلاسیکی شعرا کی اثرات واضح ہیں، کہیں کہیں علامہ اقبال کی تقلید بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس مجموعے کے جلد منظرِ عام پر آنے کی توقع ہے۔

۱۶۔ خواجہ میر دردؔ کے شاگرد

"خواجہ میر دردؔ کے شاگرد" ایک غیر مطبوعہ مسودہ ہے جس میں خواجہ میر دردؔ کے شاگردوں کا تفصیلی تعارف کروایا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاعری میں استادی شاگردی کی روایت عروج پر تھی۔ خواجہ میر دردؔ اس صدی کے اہم شاعر تھے۔ ان کے زمانے کو میر و سودا سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس صدی کی صوفیانہ فکر کے گل سر سبد خواجہ میر دردؔ ہیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اس کتاب میں خواجہ میر اثر، قیام الدین قائم، میر حسن، ہدایت اللہ ہدایت، شاہ محمد مائل، میر محمدی بیدار، ثناء اللہ فراق اور عظیم بیگ عظیم کا مکمل تعارف ان کے نمونۂ کلام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اس عہد کے شعری تذکروں کو اولیت دی ہے۔

۱۷۔ اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر

"اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" دراصل پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی نگرانی میں لکھا۔ یہ تحقیقی کام تکمیل کے بعد ڈگری کے حصول کے لیے ۱۹۵۳ء میں جمع کروایا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں نسیم صاحب کو اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ یہ تحقیقی مقالہ چار جلدوں پر مشتمل تھا۔ جب صدر شعبہ نے اسے دیکھا تو بے ساختہ

کہا کہ "یہ مقالہ لکھنے والے کی تو کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی"۔ پروفیسر میاں محمد مرغوب کہتے ہیں:

> پنجاب یونیورسٹی میں موجود ان کے ریسرچ ورک پر مشہور جرمن مستشرق، محقق اور ماہر اقبالیات وتصوف ڈاکٹر این میری شمل بھی بہت وقیع رائے رکھتی ہیں۔ میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری ڈاکٹر تبسم کے کمال کا اعتراف نہیں بلکہ یہ ڈگری کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ان سے منسوب ہے۔ مقالے کی نفاست ظاہر کرتی ہے کہ باغبان نے کہاں کہاں سے پھول لا کر اس گلستان کی چمن بندی کی ہے (۱۲)

پی ایچ ڈی کے اس مقالے کا اسلوب بہت شاندار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے موضوع کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> ۱۸۵۷ء ایک ایسی حد فاصل ہے جس کے بعد ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی زندگی میں ایک نمایاں انقلاب نمودار ہوا ہے۔ یہ دور جو پچھلی ایک صدی سے برابر اب تک چل رہا ہے، اصل میں قدیم اور جدید کی آویزش اور بہت حد تک جدید کی قدیم پر فتح کا دور ہے۔ یوں تو ساحل سندھ پر مسلمانوں کی آمد سے لے کر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی تک کئی حملہ آور بیرونی حملہ آور بیرونی ملکوں سے آتے رہے لیکن ان کے مذہب، کلچر اور زبان میں بہت حد تک مشابہت اور مماثلت پائی جاتی تھی جس کی بنا پر یہاں کے تہذیبی ڈھانچے میں کوئی نمایاں تغیر پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ پچھلے نقوش میں ہی اور رنگ بھرے جاتے تھے۔ مغربی اقوام کے آنے اور خاص طور پر سقوط لکھنؤ اور غدر دہلی کے غدر کے بعد یہ حالت بالکل بدل گئی۔ اب ملک کی باگ دوڑ جس قوم کے ہاتھ میں تھی وہ اپنے مذہب، کلچر، زبان اور سیاسی مزاج کے لحاظ سے مقامی رنگ سے بالکل مختلف تھی۔ اس نے سیاسی غلبہ پانے کے لیے ہندوستانیوں خاص طور پر مسلمانوں کے دلوں پر قابض ہونے کی ٹھانی اور اس کے لیے انھوں نے تلوار کے ساتھ زبان اور قلم سے بھی کام لیا اور تہذیب، تعلیم اور تبلیغ وتلقین کے حربوں سے ان کے اعصاب پر اور روح پر سوار ہونے کی کوشش کی (۱۳)

۱۸۔ مجھے ہے حکم اذاں

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی رباعیات کا مجموعہ "مجھے ہے حکم اذاں" کے عنوان سے زیر طبع ہے۔یہ رباعیات اردو کے معروف ادبی پرچوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی رباعیات حکیمانہ موضوعات سے مزین ہیں۔سماج، سیاست اور مذہب جیسے اہم موضوعات پر رباعیاں لکھی ہیں۔نمونے کے طور پر ایک رباعی دیکھیے:

سیاست داں سے اللہ بچائے
ہنسے خود اور لوگوں کو رلائے
عوام سادہ لوح پر مکر و فن سے
وہ ہر اک رنگ کا سکہ جمائے

۱۹۔ اردو فکشن: مشرقی اقدار کی روشنی میں

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا علمی و ادبی سرمایہ زیادہ تر صوفیانہ شاعری کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے،نثر سے انھیں دلچسپی نہیں، یہ بات محل نظر ہے،ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی کتاب "اردو فکشن مشرقی اقدار کی روشنی میں" داستان، ناول اور ڈرامے کو موضوع بحث بناتی ہے۔انھوں نے داستان میں "فسانۂ عجائب" (رجب علی بیگ سرور)، ناول میں "ابن الوقت" (مولوی نذیر احمد دہلوی) "فردوس بریں" (عبدالحلیم شرر) اور "امراؤ جان ادا" (مرزا ہادی رسوا) کو تنقید و تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔اسی طرح انھوں نے آغا حشر اور امانت لکھنوی کے ڈراموں پر تفصیلی مضامین لکھے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب داستان، ناول اور ڈرامے پر لکھے گئے مقالات کو الگ الگ شائع کروانا چاہتے تھے۔ان کے خیال تھا کہ یہ کتابیں اردو زبان و ادب کی تدریس کے عمل کی بھرپور معاونت کریں گی۔بعد میں انھوں نے ان تینوں اصناف پر اپنے مقالات کو یکجا شائع کرنے کا ارادہ کیا۔یہ کتاب تاحال زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی۔

مذہبی کتب

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کی علمی و ادبی تربیت ایک خاص مذہبی ماحول میں ہوئی ۔ عام طور پر ان کی تحریروں کا مقصد و محور للسفۂ مذہب کی روایات ہی رہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ نسیم صاحب کی ابتدائی پرورش میں ان والدہ ، جدہ کا بنیادی کردار تھا ۔ صوفیائے کرام سے والدہ کی عقیدت فرزند کی طرف منتقل ہوئی ۔ ان کی علمی نگارشات کا موضوع زیادہ تر معروف شاعر اور نقشبندی صوفی خواجہ میر درد کی شخصیت اور فن ہے ۔ ڈاکٹر صاحب خود چشتیہ سلسلے میں بیعت تھے ، بزرگان چشت کے حوالے سے ان کی تحریروں میں ایک خاص روحانی وابستگی دکھائی دیتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کی ساہیوال میں معروف بزرگ سید منظور احمد مجور نقوی مکان شریفی سے وابستگی رہی ۔ ان کی شبانہ روز محفلوں میں شمولیت سے نسیم صاحب کی سوچ میں مزید نکھار پیدا ہوا ۔ سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد وہ کچھ عرصہ صادق پبلک سکول بہاولپور سے وابستہ رہے ۔ بہاولپور میں ان کی زیادہ تر ملاقات سید شہاب دہلویؒ سے رہی ۔ ان کے رسالے "الہام" میں انھوں نے مذہبی نوعیت کے مضامین لکھنے شروع کیے ۔

عمر کے آخری سالوں میں نسیم مرحوم کا معروف چشتی بزرگ اور جامعہ فریدیہ کے مہتمم حضرت مولانا منظور احمد شاہؒ سے تعلق خاطر قائم ہوا ۔ شاہ صاحب کے زیر انتظام جامعہ فریدیہ سے ایک رسالہ "انوار الفرید" شائع ہوتا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں تسلسل کے ساتھ مختلف مذہبی مسائل و موضوعات پر مضامین لکھے ۔ انھی دنوں میں ان کی چند کتابیں منظر عام پر آ گئیں :

> ڈاکٹر نسیم کی شخصیت مذہبی و دینی رجحانات اور میلانات کا مجموعہ تھی ۔ دین و مذہب اور سلوک و تصوف سے ان کو گہری عقیدت تھی ۔ انھوں نے علمی و مذہبی تحقیق کے ذریعے فرقہ واریت کو ختم کر کے ملت اسلامیہ میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ متنازعہ مذہبی قضیات کو عام فہم انداز میں دلائل کے ساتھ سلجھاتے ہیں ۔ "نور مجسم ﷺ" اور "حیات النبی ﷺ" ایسی ہی کاوشیں ہیں ۔ "نور مجسم ﷺ" کا موضوع مسئلہ نور و بشر ہے ۔ انھوں نے قرآنی آیات و واقعات ، پیغمبروں کے حالات و سوانح ، عملی زندگی اور حیات دنیوی سے بزرگوں اور اولیا اللہ سے کشف و مراقبہ اور خواب و منام کی مثالیں اور واقعات اور روزمرہ

> زندگی سے عام مثالیں پیش کر کے مسئلہ کا مدلل حل پیش کیا ہے۔ وہ ان واقعات سے استنباط بھی کرتے ہیں۔ مصنف کا انداز بیانیہ ہے۔ وہ قاری کو کسی گہرے فلسفہ و منطق سے روشناس نہیں کراتے بل کہ ان کی ذہنی سطح پر اتر کر اور معیارِ فکر و نظر کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ (۱۴)

ان مذہبی کتب کے مطالعے سے ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے مذہبی تصورات کے بارے میں یہ نقطۂ نظر ترتیب پاتا ہے۔

ا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اپنے تصورات کی دلیل کے طور پر بزرگانِ دین کے ملفوظات اور مذہبی حکایات کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

ب۔ ان کی مذہبی تحریروں میں خطابیہ انداز نمایاں ہے۔

ج۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم مذہبی فرقہ واریت کے خلاف ہیں۔ وہ مسلمانوں کے گروہی اختلافات کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ اس نیک عمل کے اطلاق کے لیے وہ کہیں کہیں جذباتی بھی ہو جاتے ہیں۔

د۔ بعض اوقات ان تحریروں میں مصنف کے خیالات تکرار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی صورت حال آیاتِ قرآنی اور احادیثِ مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے بھی پیش آتی ہے۔

ہ۔ مختلف فروعی اختلافات کے حل کے لیے انھوں نے اندھی تقلید کی بجائے منطقی اور استدلالی انداز اختیار کیا ہے۔

ان کی مذہبی کتابوں کے نام درج کیے جا رہے ہیں:

۱۔ حیات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۲۔ نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۳۔ مسئلہ میلاد شریف
۴۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا پیغام
۵۔ مسئلہ ندائے درود شریف

عبدالوحید کا کہنا ہے:

> "حیات النبی ﷺ" نبی اکرم ﷺ کے زندہ و حیات ہونے کے مباحث پر لکھی گئی ہے۔ اس میں قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ وحی و الہام اور کشف و

وجدان کے حوالوں سے بھی مدد لی گئی ہے اور حکایات سے استدلال بھی کیا گیا ہے۔ دونوں تصانیف دو مختلف نزاعی اور اختلافی مسائل پر مبنی ہیں۔ چناں چہ طریقِ اظہار میں بیشتر عناصر مشترک بھی ہیں۔ انھوں نے ایک مذہبی سکالر کے روپ میں تعقل پسندی، دلیل و منطق اور امثال و استدلال سے قاری کے دل و دماغ کو متاثر کیا ہے اور ایک غیر محسوس انداز میں اپنی بات کو منوایا ہے۔"(۱۵)

مذکورہ کتب اور مضامین کے علاوہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت چند اور مضامین بھی قلم بند کیے ہیں:

"آستانہ اجمیر شریف کے متبرک مقامات"؛ "ایک شعر ایک سلطنت کا "مکین""؛ "احسان دانش: اردو کا ایک درویش شاعر"؛ "اردو کی ترقی و تحفظ"؛ "بابا فرید الدین گنج شکر کی اجودھن میں آمد اور مشکلات"؛ "بابا فرید الدین گنج شکر کا ایک یادگار سفر"؛ "برزخیت محمدیہ"؛ "بات شعری سرقہ کی"؛ "تصوف، ترکِ دنیا اور وحدۃ الوجود"؛ "تصوف کیا ہے؟"؛ "تخلیق کائنات۔ ایک راز دو فارمولے"؛ "دلی بارھویں ہجری کا شاعرانہ ماحول"؛ "دبستانِ دلی کا درویشی پس منظر"؛ "ذکرِ نبیؐ اور اس کی برکات"؛ "شباب دہلوی: میری نظر میں"؛ "عہدِ رسالتؐ کے نعت گو"؛ "عید میلاد النبیؐ"؛ "گرنتھ صاحب میں بابا فرید کے اشلوک"؛ "لالہ دیوان چند ساہوکار سے خواجہ محمد درویش تک"؛ "مولوی فضل حق خیر آبادی کی پہلو دار شخصیت"؛ "میاں علی محمد بسّی شریف والے"؛ "مسئلہ درود شریف"؛ "مسئلہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی کہنے کا"؛ "مسئلہ ختم درود اور نذر و نیاز کا"؛ "مسئلہ نور و بشر"؛ "مجدد الف ثانی کا مقام (مکاتیب کے آئینے میں)"؛ "مسجد قرطبہ"؛ "محمد فقیہہ دردمند کا ساقی نامہ"؛ "مثنوی مہر و ماہ"؛ "میر حسن اور شاہ مدار کی چھڑیاں"؛ "مقام آدمی"؛ "مثنوی کا آخری دور"؛ "نعت کا مفہوم"؛ "نور نامے"؛ "نبی کریمؐ کے ذکر اور نعت کی برکات"؛ "نیازی بے نیاز (عبدالستار نیازی پر)"۔(۱۶)

حوالہ جات

۱۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول"، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵
۲۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال"، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۹۲ء، ص ۶
۳۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "انٹرویو"، روزنامہ "جنگ"، لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء، جریدۂ ادب

۴۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "نسیم طیبہ"، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۳ء، ص ۴

۵۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، دیباچہ، ارکانِ اسلام، فکرِ اقبال کے آئینے میں"، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم، غیر مطبوعہ مسودہ ملکیت ڈاکٹر سعادت سعید، ص ۵

۶۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "اردو کے قدیم اور دکنی صوفیا"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲

۷۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال"، ص ۱۷

۸۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ارکانِ اسلام، فکرِ اقبال کی روشنی میں"، ص ۲

۹۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "بارہویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول"، ص ۲۰۵

۱۰۔ صابری نور مصطفیٰ، ڈاکٹر، الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات، مشرقی اقدار کی روشنی میں"، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۳

۱۱۔ سید عبدالوحید، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بطور محقق اور نقاد، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، سال ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۰

۱۲۔ میاں محمد مرغوب، "یہ نصف صدی کا قصہ ہے"، مشمولہ "ادبی مجلہ ساہیوال"، گولڈن جوبلی نمبر، ۱۹۹۴ء، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ص ۲۲۴

۱۳۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "اردو شاعری کا مذہبی اور صوفیانہ عنصر (چالیسویں قسط)"، مشمولہ "نئی شاعری"، شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۹ء، مدیر ڈاکٹر سعادت سعید، لاہور، ص ۵۱

۱۴۔ صابری نور مصطفیٰ، ڈاکٹر، الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات، مشرقی اقدار کی روشنی میں"، ص ۲۶۶

۱۵۔ سید عبدالوحید، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بطور محقق اور نقاد، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، سال ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۰

۱۶۔ صغیرا جہانگیر، ایم اے اردو کا مقالہ "الف۔ د۔ نسیم کی ادبی خدمات" مخزونہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۴۰

باب چہارم

دشتِ تحقیق میں موجِ نسیم

اردو کے قدیم شعری تذکرے ہمارے ادبی سرمایے کا وہ گراں قدر سرمایہ ہیں جن سے ہم اپنی زبان کے ادبی و تنقیدی شعور کی ابتدائی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ اردو کے قدیم تذکرہ نگاروں نے جن تنقیدی و تحقیقی اصولوں کو بنیاد بنایا ان میں ربطِ کلام، خوش فکری، تازہ مضمونوں کی تلاش، گفتگو کی صفائی، ایجاز مضامین، تہ داری، درد مندی اور طرزِ احساس وغیرہ ایسے عنوانات سے موضوعہ شعرا کی شعری صلاحیتوں کو پرکھا گیا ہے۔ ان تذکرہ نگاروں کے ہاں فارسی کا تنقیدی شعور بھی دکھائی دیتا ہے۔ اردو تحقیق کی روایت میں ان شعری تذکروں کو ابتدائی معلومات کا ذریعہ بنایا گیا۔ بیسویں صدی کی اردو تحقیق میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر وحید قریشی اہم نام ہیں۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں تحقیق و تنقید کے اس فکری دبستان سے تعلق رکھتے تھے، جس کی بنیاد پروفیسر حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے رکھی تھی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو ڈاکٹریٹ کرنے والے پہلے سکالر تھے۔ ایم اے اردو سے پی ایچ ڈی اردو کے عرصے میں ان کی تنقیدی و تحقیقی جہات کا تعین ہو چکا تھا۔ ان کی تحریروں کا مرکز و محور ادب کی مذہبی اور صوفیانہ جہات ہیں۔ ان کا تنقیدی و تحقیقی سرمایہ بذاتِ خود ان کی اس شعبے کے ساتھ دلچسپی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر نسیم صاحب اپنی تحریروں میں مذہب و تصوف کو بنیاد بناتے ہیں۔ ان کی چند تحقیقی و تنقیدی کتب شائع ہوئی ہیں، کچھ تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں "اردو کے قدیم اور چشتی صوفیا"، "بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول"، "محمد ﷺ نورِ مجسم"، "حیات النبی ﷺ"، "خواجہ میر درد کا تصوف" (مقالہ پی ایچ ڈی)، "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" (پی ایچ ڈی کا مقالہ)، "اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ

تلمیحات و مصطلحات"، "اردو فکشن: مشرقی اقدار کی روشنی میں"، "تذکرۂ لالہ رادھا"، اور "خواجہ میر درد کے شاگرد" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی سرمائے میں اچھا خاصا کام اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے ہے۔ ان کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات اور دیگر کتابوں کا تعلق بھی کسی نہ کسی طرح تاریخ ادب سے ہے۔ "اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا"، "بارھویں صدی ہجری میں دہلی کا شاعرانہ ماحول" اور "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" براہ راست تاریخ ادب سے متعلق کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آغاز ہی سے صوفیائے چشت سے گہری عقیدت تھی۔ برعظیم میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں نے دیگر سلاسل کی طریق سے ہٹ کر کام کیا۔ چوں کہ صوفیا کا عوام الناس سے تعلق سماجی اور لسانی سطح پر بھی استوار ہوتا ہے اس لیے انھوں نے بھی مقامی معاشرت کو اپنایا۔ ان بزرگوں کی کاوشوں سے عربی اور فارسی کے الفاظ مقامی زبانوں سے آمیز ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ لسانیاتی آمیزش بادی النظر میں کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ نظر آتی ہو اس کی حقیقت اور اہمیت تقابلی لسانیات کے علما ہی جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں جہاں کہیں بھی مختلف الالسان اور مختلف المذاہب اقوام کا اس طرز اور اس انداز میں وسیع پیمانے پر تاریخی میل ملاپ ہوا ہے کہ ان میں سے ایک فاتح اور دوسری مفتوح ہو یا ایک اثر انداز اور دوسری اثر پذیر ہونے کی حیثیت اور صلاحیت رکھتی ہو تو ایک نئی ثقافت اور ایک نئی زبان نے ضرور جنم لیا ہوتا ہے۔ برصغیر میں یہ صورت حال اگرچہ عرب فاتحین کے سندھ میں داخل ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی لیکن اس کے لیے صحیح، مناسب اور ساز گار فضا فتح دہلی کے قریبی زمانے میں دارالسلطنت دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں پیدا ہوئی ہے جہاں صوفیائے چشت نے ابتدائی مراحل میں تبلیغ و تلقین دین کا کام کیا ہے، اور جو ماہرین لسانیات کی اکثریت کے نزدیک اردو کی جنم بھومی ہے۔(۱)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے برصغیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں بزرگان چشت کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو کی ترقی کا ابتدائی سہرا بھی بزرگان دین کے سر باندھا ہے:

> اردو زبان چوں کہ ابتدا میں ہندی اور فارسی، عربی الفاظ سے ریختہ ہوئی ہے اس لیے اصولی طور پر اس کے معماروں میں ہر اس شخص کا نام آنا چاہیے جس نے اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے اس زمانے میں کچھ نہ کچھ حصہ ادا کیا ہے۔ جب مسلمان نئے نئے دہلی اور اس کے بعد گرد ونواح میں آئے تھے ان میں چشتی صوفیا کے کلام کو سرفہرست جگہ ملنی چاہیے، اگر چہ بعد میں بھی اس گروہ کے صوفیا اور اس سلسلے میں مرید شاعروں نے اردو کی ترویج وترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے، لیکن "سابق ہی اول ہوتے ہیں" کے مقولے کے پیش نظر ان ابتدائی صوفیائے چشت کی خاص اہمیت ہے۔ (۲)

صوفیائے کرام کے ارشادات عالیہ (جو ملفوظات کی صورت میں موجود ہیں) میں بھی مختلف زبانیں باہم آمیز ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے لے کر حضرت شیخ جمالیؒ کے زمانے تک ساتھ کے قریب اہل چشت کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔ "بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول" بھی ڈاکٹر صاحب کی ادبی تاریخ نویسی کا عمدہ نمونہ ہے۔ نسیم صاحب نے اس کتاب میں بارھویں صدی ہجری کے دبستان دہلی کے علمی وادبی رجحانات کی خوب منظر کشی کی ہے۔ اس کتاب میں قدیم شعری تذکروں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب میں اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں کے طرز زندگی کے ساتھ ساتھ بادشاہان اور عوام الناس کے اجتماعی مزاج کی خوب عکس گری کی گئی ہے۔ اس عہد کی شاعرانہ تخلیقات کے متنوع اور متفرق تجربات، زبان اور زبان دانی کے اصول وضوابط، علمائے کرام اور شعرا حضرات کے باہمی تعلقات، علم وفضل کی عمومیت، عام انسان کی زندگی میں موجود قناعت پسندی اور درویشی، موسیقی اور سماع اور اس معاشرے سے تعلق، شاعری پر ثقافتی قدروں کے اثرات، مشاعروں اور شعرا کے تخلص کا نفسیاتی پس منظر، استادی اور شاگردی کی عظیم روایت، تذکرہ نویسی اور مختلف فنی اصناف کے ورود ونزول کے اسباب واثرات، تمام کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ تاریخ نویسی کے اس موڑ پر ڈاکٹر نسیم صاحب نے شعری تذکروں کو اہمیت دی ہے، اس کا سبب ان کی مشرقی اقدار سے دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید ان کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں کہتے ہیں:

> یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اپنی تنقید وتحقیق کے دوران مشرقی روایات

کو زیادہ معتبر خیال کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مشرقی اقدار اور روایات اس قدر پختہ، مضبوط اور مستحکم ہیں کہ ہمیں مغربی روایات کی ضرورت نہیں۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دلائل میں تذکروں سے زیادہ مدد لیتے ہیں (۳)

کلاسیکی عہد کے شعری دواوین اور تذکرہ جات کی زبان میں فارسی آمیزی کی بدولت اس عہد کی منظر کشی مشکل عمل بن جاتی ہے، ہمارے ادبی مورخین کا اسلوب (ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے علاوہ) عام طور پر دقیق اور بوجھل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا اسلوب تحریر تخلیقی ہے، ان کی تحریر کی دل کشی ان کے مزاج میں موجود جمالیات کی آئینہ دار ہے۔ یہ بات درست ہے کہ:

> تحقیق میں ان (نسیم صاحب) کا اسلوب دل چسپ اور پر اثر ہے، وہ تحقیق کے لیے خشک طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس کاوش کو اپنے کمالِ فن، محققانہ ژرف نگاہی اور پختہ اسلوبِ بیان سے شاہ کار بنا دیا ہے۔ یہ ایک ایسا فن پارہ ہے کہ جس نے پوری ایک صدی کا ادبی سفر قلم بند کر دیا ہے، یوں کہ یہ کتاب محض شعرائے کرام کے مرقع دہلی کی تہذیب و ثقافت کی تصاویر ہی فراہم نہیں کرتی بل کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج مختلف اصنافِ شعر کا فروغ، ادبی کارناموں اور دہلی کے نواح میں پرورش پاتا ہوا ادبی ماحول اور اس ماحول کی بدولت اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب کے فروغ اور ترقی کا کامل منظر نامہ دکھائی دیتا ہے، تحقیق و تنقید کے دوران جتنے بھی موضوعات زیرِ بحث رہے، کی داخلی و خارجی شہادتوں کے لیے مستند کتابوں اور تذکروں تک رسائی حاصل کر کے ان میں سے حوالوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ تحقیق کے دوران وہ اپنے موضوع ہی پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں، حالاں کہ بعض محققین تحقیق کے دوران اصل موضوع سے ہٹ کر قصہ آرائی میں الجھ جاتے ہیں۔ (۴)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے، انھوں نے قدیم شعری تذکروں کے (مردہ خانوں میں لاوارث لاشوں کی طرح پڑے) شاعروں کو ان کے عہد کے شعری رجحانات کے تناظر میں شناخت دی، ان شعرا کے تفصیلات بیان کرتے ہوئے کسی مقام پر بھی ان کی ذاتی پسند ناپسند نظر نہیں

آتی۔ بارہویں صدی ہجری کے دہلی کی ادبی تاریخ لکھتے ہوئے جہاں کہیں بھی انھیں بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے وہ دلچسپ لیکن متعلقہ واقعات کی مدد سے وہ تحریر میں دل کشی پیدا کر دیتے ہیں۔

یہاں ان کے انداز بیان کے تیور دیکھیے:

> اس زمانے کے اہل دلی میں جب ہم مجلس آرائی اور بزم پسندی کا عام رجحان دیکھتے ہیں اور محافل میں لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، گپ بازی، سخن سازی کی حکایتیں پڑھتے ہیں تو ان کے زخموں پر مرہم کا گمان ہوتا ہے۔ اسے ہماری شوخی اندیشہ کہیے یا اس دلی کی خود فریبی۔ بہر حال یہ بات ضرور ہے کہ مزاح اور ظرافت کے شگوفے میں ہجوم زخم پر گل دستے کا گمان ہوتا ہے۔ میر جس کی زندگی مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ تھی جب یہ خود مشغولیت سے نکل کر راغب بہ خلق ہوتا ہے تو طنز کے نشتر لگانے ہجو کی خاک اڑانے اور مزاح کے پھول بکھیرنے سے نہیں چوکتا (۶)

دوران تحریر واقعات کچھ اس اس طرح سے بیان ہوتے ہیں کہ قاری خود کو اسی ماحول میں محسوس کرتا ہے:

> دلی کے جسم پر لالہ رنگ ہزاروں زخموں میں سے ایک زخم ایسا تھا جس کی مثال سوائے ہندوؤں کے شاید کسی اور کو نہیں ہے، میری مراد ایک عورت کا اپنے خاوند کے مرنے کے بعد آگ میں کود جانا اور جان دے دینا ہے۔ یہ کوئی خودکشی نہیں تھی بلکہ ایک مذہبی رسم تھی۔۔۔ بھگوان نرائن کھتری کی بیوہ جو محلہ وکیل پورہ شاہ جہاں آباد میں رہتی تھی۔ پچیس سال کی عمر میں اپنے شوہر کے ساتھ بڑے جوش و استقامت اور ثبات کے ساتھ ستی ہو گئی تھی۔ جب اسپ سوار اس کے شوہر کی نعش کے ساتھ دریا کی طرف چلے تو تماشائیوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ اس نگاہ کا اس نگاہ سے ملنا مشکل ہو گیا (۷)

اردو زبان و ادب کے مورخ کی حیثیت سے ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ایک اور تحقیقی کارنامے کا تذکرہ کرنا ضروری ہے، یہ ان کی برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ادبی خدمات کے لیے ترتیب دیے گئے ایک پراجیکٹ میں شمولیت ہے۔ ان کے دیگر علمی کاموں کی وجہ سے "تاریخ ادبیات مسلمانان

پاکستان و ہند" میں ان کے لکھے ہوئے ابواب کی طرف ناقدین کی زیادہ توجہ نہیں گئی۔ یہ ضخیم ادبی تاریخ ڈاکٹر علاؤ الدین صدیقی اور گروپ کیپٹن فیاض محمود کی ادارت میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس منصوبے میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اہم کردار ادا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس علمی و تحقیقی منصوبے میں اردو کے ساتھ دیگر زبانوں کی تاریخ بھی مرتب کی گئی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اس حصے میں اہم ترین ابواب تحریر کیے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" میں پنجاب یونیورسٹی کے اس ضخیم منصوبے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ گیان چند کے تجزیے میں کہیں کہیں ان کا تعصب بھی جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کتابی سلسلے کے تعارف میں وہ لکھتے ہیں:

> پنجاب یونیورسٹی لاہور نے جو ضخیم "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" شائع کی اس کی جلد ۶ تا ۱۰ اردو ادب سے متعلق ہیں اور ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئیں۔ یہ ایک مخصوص قسم کی تاریخ ہے جس میں ادب کو ملت اسلامیہ کے آئینے میں دیکھا گیا ہے۔ پہلی جلد کے تعارف میں مدیر عمومی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود کہتے ہیں کہ اس تاریخ ادب کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے تاکہ مسلمانان برصغیر کی پوری زندگی اور تہذیب کا جامع عکس پیش ہو جائے۔ اس کے لیے انھوں نے تحریری ادب کے ساتھ لوک ادب کو بھی اہمیت دی۔ اس کے علاوہ دوسرے درجے کے یعنی چھوٹے مصنفین پر بہ طور خاص توجہ کی کیوں کہ ان کے عام زندگی کی عکاسی عظیم شعرا یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ (۸)

اس منصوبے کے مقاصد کے بارے میں ڈاکٹر علاؤ الدین صدیقی ابتدا میں لکھتے ہیں:

> "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائر زندگی کی نشان دہی کی جائے جس سے اس برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی"(۹)

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے تحریر کردہ تحقیقی اور تنقیدی حصے پر یہ اعتراضات کیے ہیں:

۱۔ ان کے تحریر کردہ ابواب بے ربط اور بے ترتیب ہیں۔ ان کو لکھتے ہوئے مناسب خاکہ نہیں بنایا گیا۔ (۱۰)

ب۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب متعصبانہ ہے، ایسے لگتا ہے کہ یہ تاریخ ادب نہیں تاریخ ملت لکھی جا رہی ہے۔(۱۱)

ج۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے لکھے ہوئے تیسرے باب کا عنوان ہے: "اردو زبان و ادب کے ابتدائی نمونے"۔ اپنے مشمولات کے لحاظ سے اس باب کا عنوان "قدیم اردو ادب کی شعری اصناف" ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ اس میں تاریخی اعتبار سے نمونے دینے کی بجائے اصناف ہی کا بیان کیا گیا ہے۔(۱۲)

د۔ نسیم صاحب سے پرانے نثری اور شعری نمونوں کے تعارف میں غلطیاں ہوئی ہیں۔(۱۳)

ہ۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا انداز بیان مناظرانہ ہے۔ مثال کے طور پر دوہرے اور بشن پد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں باطنی روح صوفیا نے پھونکی ہے، گویا وہ انھیں کفر و شرک سے نکال کر اسلامی فضا میں لائے ہیں"(۱۴)

و۔ شہباز حسینی کی غزل (توں تو گئی ہے لشکری کو نفس گھوڑا اسار قیں) کو غلطی سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ بابا فرید گنج شکرؒ کے دوہے مشکوک ہیں، جھولنا بھی انھی کی ایجاد کردہ صنف ہے۔ ہندی کی ایک عروضی ہیئت کو غلط فہمی کی بنیاد پر بابا فرید گنج شکرؒ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔(۱۵)

ز۔ "مشائخ اور دوسرے مصنفین" کا بیان دو ابواب ۴ اور ۵ پر حاوی ہے۔ تاریخی ترتیب گڑبڑا گئی ہے۔(۱۶)

ح۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ایک علاحدہ عنوان کے تحت تفصیل سے لکھنے کا کوئی جواز نہیں، کیوں کہ ان کا کوئی اردو شعر یا جملہ دستیاب نہیں۔ امیر خسروؒ سے منسوب پہیلیاں اور چیستان وغیرہ کی صحت مشکوک ہے۔(۱۷)

ط۔ نسیم صاحب بے موقع مذہبی چوٹ کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر انھوں (گیان چند) نے یہ اقتباس درج کیا ہے:

"اس عمل کو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے خلفا اور مریدین نے جن کا دائرہ اثر زمانی اور مکانی لحاظ سے دور دور تک پھیلا تھا، جاری رکھا اور اس طرح جنوبی ہندی دراوڑ قوم میں برہمنوں کی ساحری اور شمالی ہند کے آریاؤں کی جادوگری سے آہستہ آہستہ نکل کر اپنی خودی کا احساس

اور اپنی عظمت کی پہچان کرنے لگیں (۱۸)

ط۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے بڑی تلاش سے تخلیق کاروں کا انبار لگایا ہے اور ان میں بہت سے غیر معروف یا کم معروف لیکن قابل ذکر مصنفین بھی ہیں۔

ی۔ بہت سے ایسے مشائخ کو علاحدہ عنوان کے تحت لایا گیا ہے جو اردو کے ادیب نہیں۔ یہ کتاب تاریخ ادب ہے تذکرۃ الاولیا نہیں۔

۱۔ روایات کے کی صحت کا خیال نہیں رکھا، غیر مستند کی تقلید کی ہے۔

۲۔ ایک علاقے کے صوفی کو دوسرے علاقے میں رکھ دیا ہے۔

۳۔ زمانی ترتیب کی تحقیق سے پابندی نہیں کی۔ (۱۹)

کتاب کا دوسرا باب "ادبی منظر" ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے لکھا ہے، یہاں ہم پہلے سے بھی زیادہ اپنی جانی پہچانی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ یہ باب بہت مفید اور معلومات افروز ہے۔ (۲۰)

ڈاکٹر گیان چند حنذکرہ بالا تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے خاص مشکل گئے ہیں۔ اس تاریخ ادب کے مطالعے کے دوران ان کا طریق بالکل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید کتاب کا عنوان ہے۔ کتاب کو موضوع کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں تک محدود کر دیا گیا تھا اس لیے ان کے اعتراضات بے جا ہیں۔ اس کتاب کے جن اجزا کو نسیم صاحب نے تحریر کیا ہے اسلوب کے لحاظ سے عمدہ ہیں اس کا اعتراف ایک جگہ پر خود گیان چند صاحب نے بھی کیا ہے۔ کچھ مقامات پر ڈاکٹر الف د نسیم صاحب کا جذباتی ہو جانا فطری ہے (اس پر تفصیلی بحث کتاب کے دوسرے باب میں موجود ہے)۔

مسلم صوفیا اور علما کے لیے زیادہ صفحات مختص کرنے کا اعتراض مناسب نہیں، ظاہر ہے مسلمان صوفیا اور علما نے اردو زبان و ادب کے ارتقا میں جو بنیادی کردار ادا کیا، اس سے انکار ممکن نہیں، ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے مستند، غیر جانب دار اور معتبر ادبی مورخ نے بھی اپنی تاریخ ادب اردو میں مسلم صوفیا و علما کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہیں۔

ڈاکٹر الف د نسیم ایک نقاد اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی مشرب انسان بھی تھے۔ ان کے ہاں جذباتی انداز بیان کے باوجود کہیں بھی حقائق سے انحراف نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر ان کی تحریر میں سے ایک اقتباس دیکھیں، انھوں نے کس غیر جانب داری سے اردو کی ترقی میں ہندو مسلم دونوں قوموں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے:

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے اردو زبان کی ابتدائی تعمیر میں اس وقت سے حصہ لینا شروع کیا تھا جب دہلی میں ابھی تک اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے کوئی آثار نہ تھے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو رسم الخط، زبان و ادب کی بنیاد اور ان کا وجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک کوششوں کا مرہونِ منت ہے''(۴۱)

ڈاکٹر نسیم مرحوم کی علمی سچائی اور ایمان داری اس بات سے بھی واضح ہے کہ انھوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''اردو شاعری کے مذہبی و فلسفیانہ عنصر'' میں تمام مذاہب کے پیروکار شعرا کی شاعری کا بلاتعصب جائزہ لیا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر الف د نسیم کا علمی سرمایہ کسی بھی فکری جانب داری سے پاک ہے،انھوں نے ہمیشہ ''حق بہ حق دار رسید'' کا اہتمام کیا ہے۔ مجموعی طور ڈاکٹر گیان چند جین بھی اس علمی و ادبی منصوبے کے معترف ہیں،اس لیے اعتراف کرتے ہیں:

کئی کمیوں کے باوجود اس تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ لکھی گئی، مکمل ہو گئی، قارئین کو میسر آ گئی۔ دورِ جدید کے بارے میں یہ اتنی طمانیت بخش نہیں جتنی قدیم اور وسطی دور کے سلسلے میں ہے۔اس کی وجہ مضمون نگاروں میں علم کی کوتاہی نہیں صفحات کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ جب تک ڈاکٹر جمیل جالبی کی مکمل ہو کر سامنے نہیں آ جاتی پنجاب یونیورسٹی کی یہ تاریخ پورا اردو ادب کی اہم ترین تاریخ رہے گی (۴۲)

مرثیے کی صنف سے ڈاکٹر الف د نسیم صاحب کی دل چسپی کا ایک اہم ثبوت ان کی کتاب ''تذکرۂ لالہ زار'' ہے۔یہ براہِ راست تاریخ نویسی تو نہیں ہے لیکن اس میں تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو جانے والے متعدد مرثیہ نگاروں کا تعارف ہے،اسے اردو کے کلاسیکی مرثیہ نگاروں کا تذکرہ کہنا بجا ہوگا۔ چوں کہ مرثیے کے فن و ارتقا پر بہت سی کتابیں موجود ہیں اس لیے انھوں نے مرثیے کی تاریخ کو دہرانے سے گریز کیا ہے۔ یہ تحقیقی کام اہم یا غیر اہم مرثیہ نگاروں کی درجہ بندی نہیں کرتا بلکہ سیدنا امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت کی نوحہ گری کرنے والوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔اس میں اصناف کا تخصص بھی نہیں ہے۔ مرثیہ کی اصل یا مروجہ ہیئت سے ہٹ کر دیگر اصناف میں مرثیہ نگاری کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ اور آپ کے خاندان کے افراد کے فضائل پر لکھی

گئی مثنویوں کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔اس تحقیقی کام میں میں میرزا محمد رفیع سودا اور میرزا غالب کے ساتھ ساتھ متعدد غیر معروف مرثیہ نگاروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر نسیم صاحب یہاں بھی قدیم تذکروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر الف د نسیم کے غیر مطبوعہ علمی کارناموں میں ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" اہم ہے۔یا اپنے موضوع کے حوالے سے وقیع اور جامع تحقیقی کارنامہ ہے۔اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اردو شاعری میں موجود صوفیانہ افکار کو موضوع بنایا گیا ہے۔فلسفہ و تصوف ڈاکٹر الف د نسیم کا پسندیدہ موضوع تھا اس لیے اس کام میں ان کے تحقیقی جواہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔شاعری اور تصوف کے موضوع پر تحریر کردہ کتب میں اس مقالے کے حوالہ جات ملتے ہیں لیکن یہ تاحال شائع نہیں ہو سکا۔"اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے خوب صورت انداز میں ہندوستان میں مختلف قوموں کے مذہب پسند مزاج کی طرف اشارہ کیا ہے:

> مذہب پرستی ہندوستان کے خمیر میں ہے،یہاں جس قوم نے بھی قدم رکھا،مذہب سے بے نیاز نہ ہو سکی،عوام پر مذہب کی اس شدید گرفت کا نتیجہ ہے کہ اس جگہ ایک قوم نے دوسری قوم کو نیچا دکھانے کے لیے ہمیشہ مذہب اور کلچر کا نعرہ بلند کیا،بڑی بڑی جنگیں اسی پس منظر میں لڑی گئیں۔مغربی اقوام کی آمد پر اقتدار کی جو جنگ اور نظریات کی جو پیکار دیکھنے میں آتی ہے۔اس میں بھی بنیادی ہاتھ مذہب اور کلچر کا ہے۔اب چوں کہ اشاعت،طباعت،تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تدریس کی بے شمار سہولتیں اور ذرائع موجود تھے اس لیے نزاع کا سب سے بڑا محاذ تقریر و تحریر کا محاذ بنا۔(۴۳)

ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی شاعری میں بھی صوفیانہ عناصر کا جائزہ لیا ہے۔بہ حیثیت مجموعی مصنف نے اس مقالے میں علم کی حقیقت،ترکیب و تشکیل عالم،جسم و غیر جسم کا تضاد،جوہر و عرض،علت و معلول،مادہ اور غیر مادہ کی اصلیت،سکون و ثبات،عناصر کی بحث،شہود و حقیقت،انسان کی حیثیت،محبت و نفرت،خود شناسی و خودی،زمان و مکاں،نظریہ اضافیت،جزو و کل،حقیقت روح،وجود و عدم،خیر و شر،(وحدت الوجود) وغیرہ کی روشنی میں اردو شاعری کی قدر

و قیمت کا تعین کیا ہے۔ جو مذہبی موضوعات سامنے آئے ہیں ان میں خدا، انبیا، ملائکہ، مذہبی کتب، روزِ معاد، تقدیر اور غیب پر ایمان اور موت و حیات اور روح سے متعلقہ مباحث کے ساتھ ساتھ حج، روزہ، زکوٰۃ، جہاد، قربانی، فاتحہ، خیرات، حلال، حرام، نصاب، نکاح، جملہ فرائض سنن، واجبات نوافل، مباح، اعمال اور مذہبی رسوم و تقاریب، اوامر و نواہی، خیر و شر، مذہبی قانون، شخصی اور مجلسی اخلاق، مذہبی قانون اور فقہ وغیرہ سے متعلق مسائل پر تفصیل کے ساتھ بحث ملتی ہے۔

> اردو شاعری میں موجود مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات بھی ڈاکٹر الف د نسیم کا ایک قابل قدر تحقیقی کام ہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں موجود ہیں لیکن یہ اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے، اردو شاعری کے عمومی مزاج کی وجہ سے اس کی نوے فی صد تلمیحات مصطلحات کا تعلق قرآن و حدیث اور مسلم تاریخ و ثقافت سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس غیر مطبوعہ علمی کام کے مختلف ابواب کی تفصیل یوں ہے (۲۵):

پہلا باب (بعنوان تلمیحات متعلق بہ حضرت آدم علیہ السلام):

اس باب میں تخلیق آدم، بدن آدم میں روح کا آنا، آدم بہ حیثیت خلیفۃ اللہ علی الارض، آدم کا بار امانت اٹھانا، تخلیق آدم کے وقت اللہ اور فرشتوں کا مکالمہ، فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اور ابلیس کا حکم خداوندی سے انکار، انکار شیطان کا نتیجہ، آدم و حوا کا خلد سے نکلنا، ان کا رونا اور توبہ کرنا، ہابیل و قابیل کا معاملہ زیر بحث آیا ہے۔

دوسرا باب (تلمیحات متعلق بہ حضرت نوح علیہ السلام):

اس باب میں حضرت نوح کا عذاب الٰہی کے لیے دعا کرنا، کشتی نوح، عمر نوح، کشتی نوح کا جودی پر ٹھہرنا اور طوفان نوح کا تفصیلی بیان ہے۔

تیسرا باب (حضرت صالح، حضرت ادریس اور حضرت ہود علیہ السلام سے متعلق تلمیحات):

اس باب میں اقوام پر عذاب الٰہی کی صورتیں، صالح کی اونٹنی کا واقعہ، قوم عاد و ثمود کے واقعات سے متعلق تلمیحات درج ہیں۔

چوتھا باب (حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت لوط علیہ السلام سے متعلق تلمیحات):

اس باب میں پرستش نجوم، ابراہیم بہ حیثیت خلیل اللہ، بت شکنی، آتش نمرود، آزر بت تراش،

اسماعیل کی قربانی، تعمیر کعبہ، کعبہ کی متعلقات، منسوبات، قوم عاد کی بربادی وغیرہ کا ذکر ہے۔

پانچواں باب (حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے متعلق تلمیحات):

اس باب میں برادران یوسف، حسن یوسف، چاہ یوسف، یوسف وزلیخا، یوسف کی خریدار زن پیرانہ سال، عزیز مصر، زندان یوسف، یوسف کے فراق میں حالت یعقوب، ماہ کنعاں، پیر کنعاں وغیرہ کی تلمیحات کا ذکر ہے۔

چھٹا باب (حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق شعری تلمیحات):

یہ باب شعیبؑ کی قوم پر عذاب الٰہی، عصائے موسوی، دربار فرعون، قارون کے خزانے، کوہ طور، ید بیضا، سامری جادوگر اور احوال بنی اسرائیل سے متعلقہ تلمیحات پر محیط ہے۔

ساتواں باب (دیگر انبیائے کرام سے متعلق تلمیحات):

اس باب میں حضرت حزقیلؑ کی دعاؤں سے مردوں کا زندہ ہونا، طالوت وجالوت کے واقعات، لحن داؤدی، تخت سلیمان، ملکہ بلقیس، ملکہ سبا، صبر ایوبؑ، اصحاب کہف، زکریاؑ کی پیرانہ سالی، یحییٰؑ کا بچپن، عزیرؑ کا سو سال بعد زندہ ہونا، حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں جانا، حضرت لقمانؑ کی اپنے بیٹے کو نصیحت، حضرت عیسیٰؑ کا بن باپ پیدا ہونا، عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کرنا، حضرت مریمؑ پر تہمت کا لگنا، صلیب عیسیٰؑ اور ان کا دوبارہ زمین پر آنا جیسی تلمیحات درج ہیں۔

آٹھواں باب (تلمیحات متعلق بہ سرکار دو عالم ﷺ):

اس باب میں نور محمدیؐ، سیدہ حلیمہ سعدیہ، واقعۂ غار حرا، غار ثور، واقعۂ معراج، معجزات رسولؐ، غزوات نبیؐ سے متعلق تلمیحات کی تفصیل ملتی ہے۔

نواں باب (اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین سے متعلقہ تلمیحات):

اس باب میں خلفائے راشدین (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور دیگر کبار صحابہ کرام حضرت بلال، حضرت اویس قرنی، حضرت سلمان فارسی، حضرت ابو ایوب انصاری رضوان اللہ علیہم اجمعین کے علاوہ اولیائے کرام سے متعلقہ تلمیحات پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔

دسواں باب (تلمیحات متعلق بہ قرآن وحدیث):

اس باب میں قرآن مجید اور احادیث رسولؐ سے متعلقہ تلمیحات کا تعارف ملتا ہے۔

گیارہواں باب (متعلقات و منسوبات):

یہ باب تفصیل سے شریعت و طریقت اور اس کے متعلقات شیخ، ناصح، زاہد، محتسب، دیر، حرم، مسجد، محراب، خمریات، جنت و دوزخ، حشر و نشر، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی صوفیانہ تصریحات پر مشتمل ہے۔ ہماری شاعری میں اب تلمیحات کا استعمال مفقود ہے، نئی نسل ان عظیم تاریخی حوالہ جات سے نابلد ہے، ڈاکٹر الف د نسیم نے مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات اور اصطلاحات کو موضوع تحقیق بنا کر اہم ترین کام کیا ہے۔ سید عبدالوحید کے مطابق:

> ڈاکٹر نسیم کی مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات کے تاریخ وار سفر کی یہ کوشش نہایت کامیاب اور نادر ہے۔ آنے والے وقت میں یہ نئی نسل کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اس کام کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی۔ مصنف نے جس طرح سے اسلامی و مذہبی تلمیحات کا تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے وہ بہت عمدہ اور منفرد ہے۔ تلمیحات، ان کا جائزہ اور صحیح اور غلط کی نشان دہی پر مصنف نے بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔ (۴۳)

ہماری جامعات میں تحقیق کا معیار اور رفتار اور اس سلسلے میں سکالرز کی علمی حیثیت بذات خود ایک مشکل سوال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کثیر علمی و ادبی سرمائے میں ان کا ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے حضرت خواجہ میر درد کی شخصیت اور فن پر نہایت عمدہ کام کیا، اردو ادب کی تاریخ میں یہ مقالہ اولین مستند ماخذ بنا۔ انھوں نے درد کی شاعری کو صوفیانہ اور فلسفیانہ آہنگ سے دیکھا، شاید اسی کام کے دوران انھیں وہ لطف و کرم میسر آیا جس نے انھیں اس سے مماثل موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سطح کی تحقیق کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ اس مقالے کا دیباچہ بذات خود ایک الگ مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے اٹھارہویں صدی کے اس اہم شاعر کے افکار کو ان کے عہد کے صوفیانہ رجحانات کے تناظر میں دیکھا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اس دور میں تو بالخصوص شاعری کو تصوف سے جدا کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ مسلم تصوف کی توضیحات میں انھوں نے تاؤ مت، اشراقیت اور ویدانت کا بھی بطور خاص تذکرہ کیا ہے، ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ان فلسفہ ہائے زندگی میں مسلم تصوف کو دیگر پر وہی فوقیت حاصل ہے جو اسلام کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتی ہے، درد شناسی کے حوالے سے یہ ابتدائی کتابوں میں سے ایک ہے:

> ڈاکٹر نسیم نے خواجہ میر دردؔ کے فلسفۂ تصوف کی امتیازی خوبیاں بیان کرنے سے پہلے تصوف کی روایت کو دکھایا اور اس روایت کی بدولت مختلف ادوار میں فروغ پانے والے نظریات بھی بیان کیے۔ اس کے علاوہ میر دردؔ کے زمانے کے حالات وواقعات، ان کی انفرادی زندگی کے حالات، ان کے خاندان کے لوگوں کا تصوف کی طرف رجحان اور تصوف کی دنیا میں ان کی اہمیت وانفرادیت کے ساتھ خواجہ میر دردؔ کی تربیت میں شامل جملہ عناصر کو بھی بیان کیا ہے(۲۵)

خواجہ میر دردؔ ہی کی نسبت سے ڈاکٹر صاحب کا ایک اور ادبی تحقیقی کام ان کا شاندار مقالہ "خواجہ میر دردؔ کے شاگرد" ہے۔ یہ ان کی موضوعِ شخصیت سے محبت اور کلاسیکی دور سے خاص انسیت کا ثبوت ہے۔ ادب کے زمانے پر اور زمانے کے ادب پر اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن بڑی شخصیت بہ یک وقت ادب اور زمانہ، دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے متسلکین میں ان کے نامور شاگرد بھی تھے۔ اردو غزل کے ارضی اور مجازی رنگوں میں عشقِ حقیقی کے شیڈز خواجہ میر درد اور ان کے شاگردوں کی بدولت ہیں۔ ابتدا میں نسیم صاحب نے خوب لکھا ہے کہ "میر درد کا فیضان، روحانیت و شعر ان کے ایسے شاگردوں کے ذریعے اگلی نسل تک گیا، جو ان کے شاگرد عزیز ہی نہیں معتقد اور ارادت مند بھی تھے"(۲۶)۔ کتاب میں تفصیل کے ساتھ خواجہ میر اثر، میر حسن، ہدایت اللہ ہدایت، ثناءاللہ فراق، میر محمدی بیدار اور شاہ محمدی مائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ میر، سودا کے دور کے یہ شعرا تاریخ کے دھندلکوں میں معدوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر الف د نسیم نے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لے کر اس دور کی مٹتی ہوئی تصویروں کو محفوظ کر لیا ہے۔

ڈاکٹر الف د نسیم مشرقی اصول وقواعد کے پاس دار ہیں، انھوں نے ادبی فن پاروں کا جائزہ لیتے ہوئے مشرق ومغرب کے دانش مندوں کی فکر سے اخذ واستفادہ کیا ہے لیکن ان کے خیال میں جدید ادبی اصناف اور ان کے موضوعات کا مشرقی علوم وفنون کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو ان کی تفہیم نہایت آسان ہو سکتی ہے۔ عام طور پر نسیم صاحب کی دل چسپی شاعری میں رہی لیکن یہاں ان کی فکشن کے حوالے سے تحریر کردہ ایک کتاب کا تذکرہ ضروری ہے۔ "اردو فکشن: مشرقی اقدار کی روشنی میں" میں ناول، داستان اور ڈرامے پر سیر حاصل مطالعات شامل ہیں۔ انھوں نے مولوی نذیر احمد کے ناول "ابن الوقت"، عبدالحلیم شرر کے ناول "فردوسِ بریں" اور مرزا ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" داستان میں رجب

علی بیگ سرور کی داستان "فسانۂ عجائب"، اور ڈراما میں آغا حشر اور امانت لکھنوی کا بہ طور خاص مطالعہ پیش کیا ہے۔

یہاں تحقیق سے زیادہ ان کی تنقیدی بصیرت کام آئی ہے۔

ڈاکٹر الف د نسیم کا مطبوعہ و غیر مطبوعہ تنقیدی و تحقیقی کام کلاسیکی ادب سے متعلق ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ علم و ادب کے نئے جزیرے دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ عقلی بنیادوں پر جانچی قابل عمل تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ اردو تحقیق میں لاہور کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے لیکن فکری اعتبار سے ان کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جو ایک خاص مقصد کے تحت خاص موضوعات کو اپنی تحقیق کا میدان بناتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲

۲۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا"، ص ۳۹

۳۔ صابری، نور مصطفیٰ: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرق القادری کی روشنی میں"، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جزوی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۵

۴۔ صابری، نور مصطفیٰ: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرق القادری کی روشنی میں"، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ص ۲۶

۵۔ صابری، نور مصطفیٰ: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرق القادری کی روشنی میں"، ص ۵۰

۶۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "بارہویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول"، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۵

۷۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "بارہویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول"، ص ۱۹۱

۸۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: "اردو کی ادبی تاریخیں"، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء، ص ۹

۹۔ علاؤالدین صدیقی: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ص ۴

۱۰۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: "اردو کی ادبی تاریخیں"، ص ۴۷۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۷۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۸۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۱۹

۱۴۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر (شریک مدیر)، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۲

۱۵۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، "اردو کی ادبی تاریخیں"، ص ۴۳۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۸۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۸۸

۱۸۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر (شریک مدیر)، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، ص ۱۱۸

۱۹۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، "اردو کی ادبی تاریخیں"، ص ۴۹۳۔۹۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۰۶

۲۱۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر (شریک مدیر)، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، ص ۱۴۳

۲۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، "اردو کی ادبی تاریخیں"، ص ۵۵۲

۲۳۔ الف۔ د۔ نسیم، "مذہب اور شاعری"، "مشعل"، نئی شاعری، شمارہ ۱۰، اگست ۲۰۱۶ء، مدیر ڈاکٹر سعادت سعید، لاہور

۲۴۔ عبدالوحید، "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بطور محقق اور نقاد"، مقالہ ایم فل، غیر مطبوعہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، سال ۲۰۰۶ء

۲۵۔ صابری نور مصطفیٰ، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات، مشرقی اقدار کی روشنی میں، ص ۱۹۳

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۱۵

باب پنجم

ذکر و فکرِ اقبالؒ اور الف۔ د۔ نسیم

علامہ اقبال نے اردو، فارسی اور انگریزی کو اپنے عمیق خیالات اور انقلابی نظریات کا ذریعہ بنایا۔ ان کا شعری پیغام ایک ایک واضح حکمت عملی متعارف کرواتا ہے۔ انھیں مفکر اسلام، شاعر مشرق، زندہ رود، دانائے راز، حکیم الامت، عندلیب باغ حجاز اور خودی کا ترجمان کہا گیا۔ اقبال کی فکر سے کسی کا اختلاف اس کا بنیادی حق اور عین فطرت انسانی کے مطابق ہے لیکن اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا کہ ان کی شاعری اور نثر نے ہر شعبۂ زندگی کے فرد کو متاثر کیا۔ اقبال کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ برصغیر اور اس باہر (ایران، ترکی، افغانستان اور وسطی ایشیا وغیرہ) اقبال شناسی کی باقاعدہ ایک روایت موجود ہے، اقبال پاکستان کے قومی شاعر ہیں، سو وطن عزیز میں ان کے ذکر اور فکر کے فروغ کے لیے کئی ادارے بھی موجود ہیں۔ مختلف پاکستانی جامعات میں اقبالیات کے تحقیق و تالیف میں مصروف ہیں۔

اس سلسلے میں فارسی اور اردو کے اساتذہ کا کردار بھی نہایت اہم رہا ہے۔ انھوں نے فکر اقبال کے فروغ کے ساتھ اپنی دل چسپی اور وابستگی کو طلبہ و طالبات تک پہنچایا۔ ان اساتذہ میں سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر افتخار صدیقی، منور مرزا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر حفیظ الرحمان خان، ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ڈاکٹر محمد آصف شامل ہیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اس روایت میں شامل ایک اہم ترین اقبال شناس ہیں۔ اقبال شناسی کے حوالے سے ان کی تین بنیادی کتابیں موجود ہیں۔

۱۔ مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال
۲۔ ارکان اسلام، فکر اقبال کی روشنی میں
۳۔ شرح کلیات اقبال (فارسی)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال اس صوفیانہ وحدۃ الوجود سے بخوبی آگاہ تھے جس کے داعی مولانا جلال الدین رومی اور شیخ محی الدین ابن عربی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے

کہ کسی زبان سے شناسائی اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ اس زبان کے صوفیانہ وفلسفیانہ تصورات کے ماہر ہیں۔

انھوں نے خواجہ فریدالدین عطارؒ، حافظ شمس الدین شیرازیؒ، محمود شبستریؒ، منصور ابن حلاجؒ، بایزید بسطامیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور خواجہ میر دردؒ کے وحدۃ الوجودی افکار کی روشنی میں علامہ اقبال کی فکر کا مطالعہ پیش کر کے اس موضوع کا شایان شان احاطہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال اسلامی تصوف نہیں بلکہ عجمی تصوف کے مخالف تھے جو گمراہی اور الحاد کا نتیجہ ہے۔ جسیم صاحب خود کہتے ہیں کہ:

> اقبال ایسے وحدۃ الوجود کے قائل تھے جس میں عبد اور معبود دونوں کے درمیان ایک فاصلہ قائم رہتا ہے۔ بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے۔ لیکن عمل تو اس معاملے کو ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو جاتا ہے کہ بندہ اپنی خودی کی معراج سے تقدیر بدلنے پر قادر ہو جاتا ہے (ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ)۔ میں نے لکھا ہے کہ اقبال نے اگر کسی بھی لمحہ پر تصوف اور صوفی کی مخالفت کی ہے تو اس تصوف اور صوفی کی ہے جو آدمی کو ترک دنیا کا رستہ دیتا ہے اور ترک دین کا۔ یعنی وہ اس تصوف کے خلاف ہیں جو عجمی روایات، ویدانتی خیالات اور افلاطونی افکار کا نتیجہ ہے، جو اکبری دور الحاد اور گمراہ درویشوں کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔ وہ اصل تصوف کو جس کے لیے انھوں نے فقر کا لفظ استعمال کیا ہے مسلمان قوم کا سرمایہ حیات کہتے ہیں اور اس کا ترک کرنا اس کے زوال کا سبب قرار دیتے ہیں۔(۱)

علامہ اقبال حرکی نظریات کے حامل اور جوش عمل کے قائل تھے، ایک مقام پر انھیں تصوف میں بے عملی نظر آئی، انھوں نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی "اسرار خودی" میں حافظ شیرازی کے خیالات کو گوسفندی قرار دیا۔ حصار تصوف پر ان باقاعدہ اختلافی صورتوں کے ان کی مخالفت بھی ہوئی۔ یہ اہل نظر کا فکری مجادلہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی اور پیرزادہ مظفر احمد فضلی ناقدین میں سے تھے۔ بعد میں اکبر الٰہ آبادی بھی اس بحث میں شامل ہو گئے۔ اقبال نے اپنی خط کتابت کے ذریعے اس موضوع پر اپنے تصورات کا دفاع کیا۔ مثال کے طور پر اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں کہتے ہیں:

> عجمی تصوف سے لٹریچر میں دل فریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام

ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ تخیلی لٹریچر بھی دنیا میں زندہ نہیں رہ
سکتا تاوقتیکہ وہ قوم کی زندگی میں اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے۔(۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے علامہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال بھی تصوف اور فلسفۂ ویدانت کے مخالف لیکن اسلامی تصوف کے قائل تھے، ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے اشکال اس عہد کے معروف عالم دین علامہ سید سلیمان ندوی سے ہونے والی خط و کتابت سے رفع ہو گئے تھے۔ نسیم صاحب نے اقبال کی مثنوی "گلشن راز جدید" کا تفصیلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور اس مثنوی کو اقبال کے نظریۂ تصوف کا ترجمان قرار دیا ہے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں: "اقبال کے بعض اشعار شہود کی طرف رغبت رکھتے تھے لیکن ان کا اصل رجحان وجودی کی طرف ہے، اور یہ بات ان کی شاعری کے غالب حصے خاص طور پر مثنوی گلشن راز جدید سے روز روشن کی طرح عیاں ہے"۔(۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم صاحب نے معتدل انداز میں اقبال کی فکر میں تصوف کے مقام پر بحث کی ہے۔ اللہ یار ثاقب اپنی کتاب "ساہیوال میں اردو نثر کی روایت" میں اسی پہلو کی نشان دہی کرتے ہیں:

> ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے تصوف اور اقبال کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے ان کی شاعری سے حقائق کا کھوج لگایا ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر ہونے والے حملوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف نہ تو ترک دنیا کا نام ہے اور نہ ہی شریعت سے دوری کا نام ہے، بلکہ تصوف شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس خوب صورت کائنات کے خالق کی تلاش کا عمل ہے۔ جو شخص اس کی تلاش عقل سے کرتا ہے وہ فلسفی کہلاتا ہے اور جو قلب سے کرتا ہے وہ صوفی کہلاتا ہے۔ علامہ اقبال نے تصوف اور صوفی کو فقیر اور فقیری سے موسوم کیا ہے۔(۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی اقبال شناسی کا ایک اور جہت اسلام کے بنیادی ارکان کی روشنی میں فکر اقبال کا مطالعہ ہے۔ "اقبال اور ارکان اسلام" ڈاکٹر صاحب کی مذہبی زاویۂ تحقیق کا ثمر ہے۔ اس میں انھوں نے تمہیدی ابواب کے بعد اقبال کی شاعری میں ارکان اسلام (کلمہ طیبہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ) کا جائزہ لیا ہے۔ اقبالیات کے موضوع پر ہونے والے تحقیقی کاموں میں یہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کو قرآن کی توضیح سے تعبیر کرنے کا اہم سبب یہ ہے کہ اس کی معنویت

اور قرآنی مطالب میں ایک خاص ربط موجود ہے۔ اقبال کی شاعری میں بھی وہ روحانی والہامی انداز ہے جو قرآن سے گہری وابستگی کے باعث فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے ایک مثالی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ اقبال کے شعری پیغام کے بارے میں درست کہا گیا ہے کہ:

> ارکان اسلام کی سماجی اور روحانی افادیت کی روشنی میں کلام اقبال کا مطالعہ اسلام کی روح تک رسائی کی ایک پرخلوص کوشش ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ صدق مقالی اور نیک اعمال کے ورود کر سکتا ہے۔ ارکان اسلام کو مانے بغیر کوئی شخص حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج پر مکمل اعتقاد ان کے ادب و احترام کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔ ان ارکان کا مقصود مسلمانوں کو ایک ملت کی حیثیت سے دنیا میں عروج و سرفرازی عطا کرنا ہے۔ باعمل مسلمان کی خودی اس کی انسانی عزت نفس کو ذلت و رسوائی سے بچاتی ہے۔ اس کا تصور توحید اسے کسی دنیاوی طاقت کے آگے جھکنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ ایک غیور انسان کی مانند اپنے فقر کا رستہ اختیار کرتا ہے کہ جس کا مقصود فنا فی اللہ کی حقانیت کا ادراک و شعور ہے۔ مسلمان لا کی آندھیوں میں گم ہو کر دنیاوی منفعتوں سے فیض یاب ہونے کی بجائے الا اللہ کی منزل کی جانب گامزن ہو کر روحانی سرمایوں سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ (۵)

ڈاکٹر الف د نسیم کی علامہ محمد اقبال کے فارسی کلیات کی شرح بھی اپنی نوعیت کا مختلف کام ہے۔ انھوں نے علامہ کی فارسی شاعری کی تشریح کرتے ہوئے یہ خیال رکھا ہے کہ ہر ذہنی سطح کا قاری اس سے اخذ و استفادہ کر سکے۔ اس مدلل اور مربوط تحقیقی کام میں کلیات اقبال فارسی کے اصل مطالب کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افتخار جاوید اسی حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ان کا انفرادی کام اقبال کے فارسی کلام کی تشریح و توضیح ہے۔ اقبال نے زیادہ لکھا بھی فارسی میں سو اس کلام کی معرفت ہمارے جیسے اردو دان جتنے کے لیے اور ضروری تھی۔ اقبال کی کوئی ایسی فارسی کتاب نہیں جس کی تشریح انھوں نے نہ کی ہو۔ انھوں نے تمام فارسی کلام کا ترجمہ بھی کیا اور ساتھ مطالب بھی لکھے۔ (۶)

ڈاکٹر نسیم صاحب کی اقبال کے فارسی کلام کی شرح فکری اور فنی اعتبار سے شان دار ہے۔ شاعری میں ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ یہ دراصل دو تہذیبوں کا معانقہ

ہوتا ہے۔ مصنف کی روح کا ترجمے میں حلول کر جانا ضروری ہے۔ ظاہر ہے یہ اقبال کے فارسی کلام کا منظوم ترجمہ نہیں بل کہ فکر اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک سنجیدہ کاوش ہے۔ اس کے باوجود ایک بڑے شاعر کے فلسفیانہ افکار کو پورے ابلاغ کے ساتھ ترجمہ کرنا آسان کام نہیں۔ ہر زبان دوسری زبانوں سے الگ مزاج رکھتی ہے۔ اس کی نشان دہی کرنا مترجم و شارح کا فرض ہے۔ مترجم نگار اگر کسی زبان میں سرایت کر جانے والی دوسری زبانوں سے ناواقف ہے تو لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتا ہے اور یوں وہ مفاہیم اور اشارے جو ان الفاظ کے پس منظر میں موجود ہیں، ترجمے میں مفقود ہو جاتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر عطش درانی کی اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ:

> سو فیصدی کل ترجمہ ممکن ہی نہیں اور جسے ہم کلی ترجمہ کہتے ہیں دراصل کلی متبادل کہنا چاہیے، دراصل ترجمے کی تمام سطحوں پر جب ہم کلی مترادف پیش نہیں کر سکتے تو ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہم صرف مترادف یا متبادل کو استعمال میں لاتے ہیں"(۷)

ڈاکٹر الف د نسیم نے کلام اقبال (فارسی) کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود اصل متن کی تفہیم ہوتا ہے لیکن جہاں وضاحت کی ضرورت محسوس ہو متن کی وضاحت کے لیے وہ قوسین کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک مثال دیکھیے:

غوغائے کارخانہ آہن گری زمن
گلبانگ ارغنون کلیسا ازان تو
ایں خاک وآنچہ درشکم او ازان من
وز خاک تابہ عرش معلا ازان تو (قسمت نامہ سرمایہ دار ومزدور)

شرح: (سرمایہ دار مزدور کو طرح طرح کے فریب دے کر اس کی محنت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جملہ اشعار میں طنزیہ طور پر اس کی طرف اشارہ ہے۔ سرمایہ دار اس شعر میں کہتا ہے کہ لوہا ڈھالنے والے کارخانے کی مشینوں کا شور تو میری وجہ سے ہے یعنی میں نے یہ کارخانہ لگایا ہے۔ گرجا کے باجے کا شور تیرے لیے ہے۔ (مراد یہ کہ اس کے مزے میں لوں گا اور تو مذہب کی افیون کھا کر مست رہ)۔ یہ زمین اور اس کے اندر جو کچھ ہے میرے لیے ہے اور اس زمین سے لے کر آسمان تک جو کچھ ہے تمھارے لیے ہے(۸)

اسی طرح اقبال کی نظم "خلافت و ملوکیت" کے ان اشعار کا ترجمہ دیکھیے:

عرب خود را بہ نورِ مصطفیٰ ﷺ سوخت
چراغِ مردۂ مشرق برافروخت
ولیکن آں خلافت راہ گم کرد
کہ اول مومناں را شاہی آموخت (خلافت و ملوکیت)

شرح: اہل عرب نے خود کو نورِ مصطفوی ﷺ سے منور کیا، (اور پھر) اس نور سے انھوں نے مشرق کے بجھے ہوئے چراغ کو روشن کیا (اسلام اور اس کی تعلیمات کی روشنی کو پھیلا کر ظلمت کو دور کیا، باطل کو مٹایا اور حق کو رائج کیا)۔ لیکن خلافت نے اس راہ کو گم کر دیا، جس نے سب سے پہلے اہل ایمان کو روشنی سکھائی (یعنی اصل خلافت خلافتِ راشدہ تک رہی، اس کے بعد خلافت کے نام پر بادشاہت ہوتی رہی)(۹)

نثر کی نسبت شاعری کا ترجمہ مشکل ہے، شعری پیچیدگیاں اصل عبارت کو سمجھنے میں حائل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر الف د نسیم نے اقبال کی فارسی شاعری کی تفہیم کچھ اس انداز میں کی ہے کہ ہر سطح کے قاری کے لیے آسانی ہے۔

ڈاکٹر الف د نسیم کا علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر موجود تحقیقی سرمایہ قابل ذکر ہے۔ انھوں نے حضرت علامہ کے فلسفۂ فکر کی خوب ترجمانی کی ہے۔ اقبال کی عظمت و رفعت کے سبب ان کے آثار بھی عظیم و رفیع ہیں۔ اقوامِ مشرق کو ان کی شاعری پر ناز ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر نسیم نے اپنے اقبالیات کے حوالے سے کیے گئے کام میں اقبال کی آفاقی فکر، شاعری کے سوز و ساز اور ان کے دیے ہوئے جہاں گیری و جہاں بانی کے اصولوں پر خوب بحث کی ہے۔ ان کا اقبالیات کے موضوع پر کیا جانے والا تحقیقی کام شان دار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الف د نسیم، ڈاکٹر: "آغاز و عروج"، روزنامہ "جنگ" لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء، جریدۂ ادب
۲۔ الف د نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال"، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۴
۳۔ الف د نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال"، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۴ء، ص ۷۷
۴۔ ثاقب ... "ساہیوال میں اردو کی روایت"، ساہیوال، ... پبلشرز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۹۱
۵۔ سعادت سعید، ڈاکٹر: "ارکانِ اسلام، فکرِ اقبال کی روشنی میں"، ص ۹
۶۔ ... "باپ جیسا"، روزنامہ "دنیا" لاہور، ۱۹ جنوری ۲۰۲۱ء
۷۔ معین الدین عقیل (مرتب): "منتخباتِ اخبارِ اردو"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۶
۸۔ الف د نسیم، ڈاکٹر: "شرح کلیاتِ اقبال فارسی"، لاہور: شیخ بشیر احمد اینڈ سنز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۳۰
۹۔ الف د نسیم، ڈاکٹر: "شرح کلیاتِ اقبال فارسی"، ص ۳۸۷

باب ششم

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا نظریہ شعروادب

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم نے کلاسیکی اور جدید اردو شاعری کے بارے میں کئی مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔وہ خواجہ میر درد کی تقلید میں شاعری کو فن شریف قرار دیتے تھے۔ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" کے عنوان سے لکھا گیا تھا۔ایم اے میں انھوں نے خواجہ میر درد کی صوفیانہ شاعری پر مقالہ لکھا تھا۔جدید شاعروں میں انھوں نے علامہ اقبال کی فارسی اور اردو شاعری کو موضوع اظہار بنایا۔غالب پر نقوش لاہور میں شائع ہونے والے ان کے مقالے میں انھوں نے شاعری کے لیے تصوف،مذہب اور فلسفہ کے امتزاج کو لازمی سمجھا تھا۔بقول الف۔د۔نسیم:

> "میں نے اردو شاعری کے فلسفیانہ اور مذہبی مزاج کی تلاش میں جن موضوعات کو اپنے سامنے رکھا ان میں فلسفے کے حوالے سے علم کی حقیقت،ترکیب،تشکیل عالم،جسم و غیر جسم کا تضاد،جوہر و عرض،علت و معلول،مادہ اور غیر مادہ کی اصلیت،سکون و ثبات،عناصر کی بحث،شہود و حقیقت،انسان کی حیثیت،محبت و نفرت،خود شناسی و خودی،زمان و مکاں،نظریہ اضافیت،جزو و کل،حقیقت روح،وجود و عدم،خیر و شر،(وحدۃ الوجود) وغیرہ اہم ہیں اور مذہب کے حوالے سے جو موضوعات سامنے آئے ہیں وہ ہیں خدا،انبیا،ملائک،مذہبی کتب،روز معاد،تقدیر اور غیب پر ایمان اور موت و حیات اور روح سے متعلقہ مباحث کے ساتھ ساتھ حج،روزہ،زکوٰۃ،جہاد،قربانی،فاتحہ،خیرات،حلال،حرام،نصاب،نکاح،جملہ فرائض سنن،واجبات نوافل،مباح،اعمال اور مذہبی رسوم و تقاریب،اوامر و نواہی،خیر و شر،مذہبی قانون،شخصی اور مجلسی اخلاق مذہبی قانون اور فقہ وغیرہ سے متعلق مسائل۔میں نے ان سب کو اردو شاعری کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش

کی ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا شاعری اس قسم کے موضوعات کی متحمل ہو سکتی ہے؟" انھوں نے کہا:

"شاعری میں وقتاً فوقتاً یہ موضوعات ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ میرے خیال میں مذہب و فلسفہ کی طرح شاعری بھی نہایت قدیم زمانے کی پیداوار ہے۔ شاعری کے وجود کے آثار اس زمانے میں نظر آتے ہیں جب انسان کائنات کے ساحرانہ نظریہ میں یقین رکھتا تھا اور مافوق الفطرت طاقتوں خصوصاً جنوں، پریوں، دیوؤں اور روحوں سے مرعوب تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسانی ذہن میں خدا کے کسی واضح تصور نے تشکیل نہ پائی تھی اور مذہب ایک با قاعدہ صورت میں اس کے سامنے نہ آیا تھا۔ اس وقت لوگوں کے اجتماعی اظہار کا ذریعہ یا تو ناچ تھے جن کے ساتھ پاؤں اور ڈھول کی قسم کے ساز کی متناسب اور متوازن حرکات و سکنات شامل ہوتی تھیں اور یا ایسے بول تھے جن میں کسی حد تک آہنگ موجود ہوتا تھا۔ یہ شاعری کی اولین شکل تھی۔ بعد میں جب انسانی ذہن ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں وہ اپنے سے کسی برتر ہستی کا مفہوم سمجھنے اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنے کے قابل ہوا تو ان رونک بولوں کی جگہ بھجنوں نے لے لی۔ جن میں کائنات پر غور و فکر کی سطحی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا جب احساسات کا فروغ ہوا جو قبائل کی روایت کے ترجمان تھے۔ اسی لیے اس دور کے ادب کو عموماً قبیلے کے ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ادب کا یہ قافلہ شہری ادب، علاقائی ادب، قومی ادب وغیرہ کی منازل سے گزرتا ہوا آج آفاقی ادب کے مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اس قافلے کی رفتار کے ساتھ ساتھ شاعری بھی اپنے رجحانات بدلتی رہی ہے اور کلاسیکیت، رومانیت، فطرت نگاری، اثریت، اظہاریت اور مستقبلیت کی تحریکوں میں ظاہر ہوتی ہوئی آج سائنس کی دنیا سے مفاہمت پیدا کر چکی ہے اور بڑے بڑے پیچیدہ اور خشک مسائل کو اپنی آغوش میں لے رہی ہے۔ اصل میں شاعری کے موضوعات کی تعیین مشکل ہے۔ ڈریو کے الفاظ میں "شاعر اپنا خام مواد انسانی تجربہ سے

حاصل کرتا ہے "اور کون نہیں جانتا کہ انسانی تجربہ لامحدود ہے۔ کائنات کی ہر شے، حیات انسانی کا ہر پہلو اور آدمی کا ہر انفرادی اور اجتماعی مسئلہ شاعری کا موضوع بن سکتا ہے۔ شاعروں کے اندر شرر بھڑک رہے ہوتے ہیں وہ انھیں کہیں گرانا کہیں جلانا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے سینے میں موجزن جذبات کے اظہار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ جذبات کئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ کبھی آنسو بن کر ان کے پاؤں پر گرتے ہیں اور کبھی نالے بن کر دعاؤں اور مناجاتوں کے ساتھ سوئے عالم افلاک پرواز کرتے ہیں۔ اس وقت مناجاتوں اور دعاؤں کے الفاظ شعر سے کم نہیں ہوتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں تکنیک اور آہنگ کی وہ خارجی صورت نہیں ہوتی جو شاعری کے مسلمات میں شامل ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے الفاظ میں کسی حد تک توازن اور آہنگ ضرور ہوتا ہے۔ شدید جذبہ آہنگ کا محتاج ہے، وہ اپنے اظہار کے لیے خود بخود متوازن پیانے گھڑ لیتا ہے۔"(۱)

شعر یا شاعری کے بارے میں انھوں نے اپنی غزلوں میں یہ کہا ہے:

ذکر حسن یار نے اس کو کیا ہے دل پسند
ورنہ میرا شعر کیا ہے، شعر کا اعجاز کیا
شعر میں آتا نہیں رنگ غزل
جب تک شامل نہ ہو خون جگر
دیتے ہیں جس کو نام غزل عاملان شعر
وہ حرفی شکل ہے غم ہجراں کے داغ کی(۲)

اس پس منظر میں ان کی یہ غزلیں ملاحظہ ہوں:

میکدہ جہان ہے میکدہ الست
کوئی سبو شناس ہے کوئی ہے خم پرست
کوئی فقیر بے سروساماں کوئی ہے شاہ
شہر قضا میں رہتے ہیں سارے بلند و پست

اک وہ کہ سیرِ وسعتِ شہرِ ابد میں گم
اک یہ کہ آب انفس و آفاق سے ہے مست
اہلِ دل و نظر کے سوا کس کو ہے خبر
معراج جس کا نام ہے وہ عشق کی ہے جست
اک حرفِ عشق پڑھتے ہی مسمار ہو گئی
کمزور تھی اے صاحبِ منطق بنائے ہست
نیرنگیِ خیال سے ہر چیز کا وجود
اک وہم کا نشان ہے ساری کشاد و بست
چھو کر مجھے نہ گزری نسیمِ نظر کبھی
میری رہِ حیات میں ہر اک ہے گل بدست (۳)

عمر اپنی تو گئی عالمِ دوں کی خاطر
دشت میں پھرتے رہے صید زبوں کی خاطر
عارضی حسن کو دی حسنِ ازل پہ ترجیح
کر دیا ترک حقیقت کو فسوں کی خاطر
اک قلندر نے کیا فاش جو سرِ عالم
عقل کو بیچ دیا ہم نے جنوں کی خاطر
جز درِ فقر ملی ہم کو نہ یہ خیرِ کثیر
در بدر پھرتے رہے جذبِ دروں کی خاطر
مہد سے لحد تک ہم نے تو دنیا مانگی
عمر برباد گئی جھوٹے سکوں کی خاطر
خود شناسی سے بڑی کوئی نہیں ہے دولت
نورِ باطن نہ بکا حسنِ بروں کی خاطر
عارضِ گل پہ رہی مرتی نسیمِ سحری
پھینکا ہے بادۂ دل، جامِ نگوں کی خاطر (۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا خیال ہے کہ فکر، تصوف اور شاعری ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فکر، تصوف اور شاعری ایک ہی راہ کے مسافر ہیں:

"شاعری میں رمزیت اور اشاریت کی جو اہمیت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صوفی ان کا شاعر سے بھی زیادہ خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے اور جو ایسا نہیں کر سکتا اس کا سر منصور اور سرمد کی طرح اڑا دیا جاتا ہے۔ صوفی سراپا عشق ہے۔ وہ حسن مطلق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ صوفی کے جذبات و احساسات کا تانا بانا حسن و عشق ہی سے بنا ہوا ہے۔ شاعر خاص کر غزل گو شاعر کا بنیادی موضوع بھی یہی ہے۔ صوفی اپنے جذبات کے بلند مقام پر غزل گو شاعر کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کی عمومی باتوں میں بھی غزلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذب و مستی کے عالم میں جو کچھ کہتا ہے غزل کے مضامین کی نکھری ہوئی اور پاکیزہ شکل ہے۔ چناں چہ اس بنا پر تصوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" یعنی تصوف شعر کہنے کے لیے خوب ہے۔ شاعر کو اپنا مقصد جذب اور تخیل کی آمیزش سے شاعرانہ صداقت کی صورت میں پیش کرنا چاہیے۔ مشرقی شاعری میں شاعرانہ صداقت کو اسی لیے شاعری کی جان کہا جاتا ہے۔ اس سے شاعر کے مقصد میں حسن اور دوسروں کے لیے اپیل پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک شاعر اثر انگیزی کی یہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے تو ہمیں اس کے مذہبی، اخلاقی اور تبلیغی مقاصد کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اس کی "شاعرانہ تبلیغ" سے جو ہمارے ذوق جمال کی تسکین بھی کر رہی ہے۔ ایک مبلغ سے زیادہ اثر لیں گے۔ ایک خطیب اور مبلغ بھی حاضرین کے جذبات کا کسی حد تک خیال رکھتا ہے لیکن اس کے پیش نظر اور بھی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اسے سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اپنے جذبات کی بجائے دوسروں کے جذبات کا بہت حد تک مطیع ہونا پڑتا ہے لیکن شاعر ان سب بندشوں اور پابندیوں سے آزاد اور بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ ہر اس جذبے کو جو اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے بے دریغ کہہ دیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا خیال ہے کہ فکر، تصوف اور شاعری ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فکر، تصوف اور شاعری ایک ہی راہ کے مسافر ہیں:

"شاعری میں رمزیت اور اشاریت کی جو اہمیت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صوفی ان کا شاعر سے بھی زیادہ خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے اور جو ایسا نہیں کر سکتا اس کا سر منصور اور سرمد کی طرح اڑا دیا جاتا ہے۔ صوفی سراپا عشق ہے۔ وہ حسن مطلق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ صوفی کے جذبات و احساسات کا تانا بانا حسن و عشق ہی سے بنا ہوا ہے۔ شاعر خاص کر غزل گو شاعر کا بنیادی موضوع بھی یہی ہے۔ صوفی اپنے جذبات کے بلند مقام پر غزل گو شاعر کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کی عمومی باتوں میں بھی غزلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذب و مستی کے عالم میں جو کچھ کہتا ہے غزل کے مضامین کی نکھری ہوئی اور پاکیزہ شکل ہے۔ چناں چہ اس بنا پر تصوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" یعنی تصوف شعر کہنے کے لیے خوب ہے۔ شاعر کو اپنا مقصد جذبہ اور تخیل کی آمیزش سے شاعرانہ صداقت کی صورت میں پیش کرنا چاہیے۔ مشرقی شاعری میں شاعرانہ صداقت کو اسی لیے شاعری کی جان کہا جاتا ہے۔ اس سے شاعر کے مقصد میں حسن اور دوسروں کے لیے اپیل پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک شاعر اثر انگیزی کی یہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے تو ہمیں اس کے مذہبی، اخلاقی اور تبلیغی مقاصد کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اس کی "شاعرانہ تبلیغ" سے جو ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین بھی کر رہی ہے۔ ایک مبلغ سے زیادہ اثر لیں گے۔ ایک خطیب اور مبلغ بھی حاضرین کے جذبات کا کسی حد تک خیال رکھتا ہے لیکن اس کے پیش نظر اور بھی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں، اسے سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اپنے جذبات کی بجائے دوسروں کے جذبات کا بہت حد تک مطیع ہونا پڑتا ہے لیکن شاعر ان سب بندشوں اور پابندیوں سے آزاد اور بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ ہر اس جذبے کو جو اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے بے دریغ کہہ دیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر

اس کی مقصدیت آرٹ کے "جذبہ کار" اور "خیال بافت" پردوں میں چھپ
جاتی ہے۔"(۵)

فلسفے اور شاعری کے باہمی تعلق کے بارے میں الف۔د۔نسیم کا نقطۂ نظر واضح ہے:

"فلسفہ کا معاملہ، مذہب و اخلاق سے قدرے مختلف ہے۔ فلسفہ حقائق اشیا کے ادراک کے استدلالی اور عقلی طریقے کا نام ہے جو بظاہر شاعری کی ضد معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جذبہ اور فکر میں بڑا بعد ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کی آمیزش ممکن نہیں۔ عملی دنیا میں صوفی اس اجتماع کی ایک زندہ مثال ہے۔ یہی اتصال جب ایک شاعر کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو وہ فلسفی شاعر کہلاتا ہے اور فکر کو جذبہ و تخیل کا رنگ دے کر پیش کرتا ہے۔ اپنے فکر کے منتہا پر پہنچ کر ایک فلسفی دلائل اور براہین کی دنیا سے نکل کر جب حقیقت سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس میں جذبہ اور تخیل اس طرح بیدار ہو جاتا ہے جس طرح ایک شاعر میں۔ وہ فلسفہ کے حقائق کی بجائے اس کے رویا میں محو ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک مابعد الطبیعیاتی نظام کا نظارہ آ جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ شاعر کا تخیل خود اسے بناتا ہے اور فلسفی کا فکر پوشیدہ حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلسفہ وہ نقطہ ہے جہاں نثر شاعری کے قریب پہنچ جاتی ہے۔۔۔۔۔"(۶)

"فلسفی بھی شاعر کی طرح کی زبان استعمال کرتا ہے لیکن وہ نثر لکھنے پر مجبور ہے۔ جارج سنتایانا کے قول کے مطابق "ایک فلسفی جن حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے وہ ذہن کو حسین اور جاذب معلوم ہوتے ہیں شاعری کا تعلق رویائے فلسفہ سے ہے نہ کہ منطقی حقیقت سے۔ کالنگ وڈ غالباً اسی بنا پر فلسفہ کو ادب کی ایک شاخ قرار دیتا ہے۔ فلسفی حقیقت تک پہنچنے کے لیے استدلال سے کام لیتا ہے۔ وہ ایک ذہنی تجربہ سے دوسرے تجربہ اور اس طرح مسلسل تجربات سے حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ اس کا کام غور و فکر سے اشیا کا تجزیہ کرنا ہے۔ وہ عمومیت سے وحدت کی طرف آتا ہے۔ ایک سائنس دان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی معلومات کو ریاضیاتی اور تجرباتی کسوٹی پر پرکھتا ہے لیکن شاعر ان دونوں کے

برعکس اپنے غور وفکر کے نتائج کو جذبہ اور تخیل کی رنگ آمیزی سے پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے جذبہ اور احساس کو اپیل کرتا ہے۔ وہ اپنے نتائج کو زیادہ موثر بنانے کے لیے تصویریت اور محاکات سے کام لیتا ہے۔ رمز و اشاریت سے کشش پیدا کرتا ہے۔ تشبیہ اور استعارے کے عمل سے اس جاذب نظر بناتا ہے۔ یہ عمل فلسفہ کی تمام شاخوں مثلاً علم الکلام، ریاضیات، سائنس اور طب کے مسائل میں بھی جاری رکھا جا سکتا ہے۔"(۷)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم شعر و ادب کو شرافت اور اخلاقیات کی حدود میں رکھنے کے قائل تھے۔ گورنمنٹ کالج منٹگمری کے مجلہ ساہیوال میں شائع ہونے والی ان کی کئی غزلوں میں سے ذیل میں دو غزلیں درج کی جاتی ہیں:

گلشن دہر کی ہر شے ہمہ تن ذوق نمو
مشت پر، تار نوا، جلوۂ گل، موجہ بو
پھر کسی حور شمائل کے نظارے کے لیے
دیدۂ چاک گریباں نے کیا خوں سے وضو
ہو سکے گی جو ابد تک نہ شناسائے خمار
تیری آنکھوں میں ہے وہ مستی بے جام و سبو
رونق حسن ہے مرہون نظر بازی عشق
ہے رگ گل میں رواں سینۂ بلبل کا لہو
زخم جو خنجر تقدیر سے کھا بیٹھے ہیں
چارہ گر سوزن تدبیر سے ہوں گے نہ رفو
رشک شاہی ہے وہ درویش میسر ہے جسے
بزم یاران کہن، نغمہ مطرب لب جو
گلشن شوق میں پھر آیا کوئی مثل نسیم
دل ربا، تنگ قبا، غنچہ دہن، تند گلو(۸)

پھر ہے ساقی بہ ناز جلوہ فروش
آ رہی ہے صدائے نوشا نوش
دشمن دیں، رہزن ایماں
شیشہ در دست، گیسواں بر دوش
ہے وہ رشک بہارہ پا بہ رکاب
بہر قزاقی بصیرت و ہوش
جام چھلکا کہ حور مسکائی
قلقل مینا ہے کہ ورد سروش
پائی رندوں نے عشرت امروز
غرق ہے کر کے فکر فردا و دوش
جلوۂ حسن نقش گلزار
وہ ہے فردوس دل یہ جنت گوش
خواہی گر سیر سلسبیل نسیم
تا توانی بہ حق پرستی کوش(۹)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اپنا نظریہ شعر واضح کرنے کے لیے اپنے کئی مضامین میں اپنا تصور پیش کیا ہے۔ اپنے مضمون اردو کے منظوم قصے میں وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں پر مکمل کر تنقید کرتے ہیں اور ان ناقدین کو غلط قرار دیتے ہیں جو ان کی مثنویوں کو میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر کی مثنوی "خواب وخیال" سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

"آخر میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو جان عالم کے لکھنو کی اس معاشرتی اور تہذیبی فضا میں سانس لیتی ہیں جس کے خلاف ردعمل کے طور پر میر شکوہ آبادی نے مثنوی حجاب نہاں لکھی ہے۔ شوق کی مثنویاں عشق بے باک، حسن بے حجاب، جذبات بے قید اور بے حیائی کی جولاں گاہ کو اس حد کو چھو لیتی ہیں، جہاں قانون حرکت میں آ جاتا ہے۔ یہ مثنویاں ایک عرصہ تک قانون زنداں میں مقید رہی ہیں تاکہ جملہ انسانیت میں جلوہ گر عروس شرافت، بے حیائی

کی نامحرمیت سے دوچار نہ ہونے پائے۔ زمانۂ حاضرہ میں جب حیا اور شرافت نے اپنی معنی بدل لیے ہیں اور شہد پن اور رنڈی بازی نے ثقافت اور عریانی اور بے حیائی نے آرٹ کا لیبل لگا لیا ہے شوق کی مثنویاں منصۂ شہود پر آ گئی ہیں۔ زبان کی صفائی، محاورے کی صحت، بیان کی گھلاوٹ، اظہار کی سادگی، جذبات کی عکاسی، سراپا کی نقاشی اور معاملہ بندی کی صنّاعت و صناعی کے لحاظ سے اردو میں اس پائے کی بہت کم مثنویاں ہیں۔ میر اثر کے علاوہ ان کی دو مثنویوں "زہر عشق" اور "بہار عشق" کے متعلق ہے۔ لذت عشق اور فریب عشق کا مقام ان سے کم تر ہے۔ یہ یا تو ان کی نو مشقی کے زمانے کی ہیں یا پھر ان کی نسبت شوق سے غلط ہے۔ زبان اور فن دونوں اعتبار سے مثنویات کی ان دو گروہوں میں فرق اور تمیز ہے۔ زبان، فن اور اخلاق کے اعتبار سے شوق کی مثنویوں پر اب تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ کہنا لاحاصل ہے۔۔ میرے سامنے ان کا ایک اور دور رُخی خاص پہلو ہے جس پر میں اس مقالے کے ابتدائی صفحات پر کچھ اشارہ بھی کر چکا ہوں۔ ایک تو یہ کہ شوق کی مثنویات کو میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" کا عکس خالی کہنا صحیح نہیں ہے۔ یہ شوق کے اپنے اضطراب نہانی کی خارجی تصویریں ہیں جو انہیں مجبوراً کھینچنا پڑی ہیں۔ میر اثر کی مثنوی ایک افسانہ ہے جو انھوں نے محض نفس سرکش کی سرتابی دکھانے اور اس کی عنان کشی کی تلقین کے لیے لکھی ہے۔ بعض دفعہ برائی کو اس کے اصل بھیانک رنگ میں ظاہر کرنے یا اس کا برا انجام دکھانے سے بھی اصلاح نفس کا کام لیا جاتا ہے۔ میر اثر کی مثنوی اس نفسیاتی اصول کے تحت لکھی گئی ہے۔ ان کی کہانی کے مطالعہ کے دوران میں نفس جو تھوڑی بہت لذت محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی انجام تک گئی میں بدل جاتی ہے اور دامن عشق صادق کی سلسبیل و کوثر سے ایک نیا ذائقہ حاصل کرتا ہے۔ کہانی میں برائی کی تصویر کشی لذت اندوزی کے لیے ہے یا اصلاح احوال کے لیے یہ خود ایک بڑا اہم اور نازک مسئلہ ہے جس کی چھیڑنا اس مقالے کا مقصد نہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ قاری کے پاس اگر ذوق سلیم کا صحیح ترازو ہے تو وہ دونوں

پلڑوں میں فرق دیکھ سکتا ہے۔ شاید یہ فرق ایک طرف مثنوی خواب وخیال اور دوسری طرف آسکر وائلڈ اور اس کے چیلے چانٹوں کی تحریروں کے پلڑے سامنے رکھ کر معلوم ہو سکے۔"(۱۰)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم شعر و ادب کو فحاشی اور عریانی سے دور دیکھنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے انھوں نے کئی بار بقول کسے "منٹو اور عصمت چغتائی" پر سنگ باری بھی کی تھی۔ نثر میں بھی اگر کوئی تاریخ اسلام پر یا اسلامی کلچر پر بہتان بازی کرتا تو وہ اس کے خلاف بھرپور ردعمل کا اظہار کرتے۔ ان کے فرزند سعادت سعید کہتے ہیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں علی عباس جلالپوری کی بعض تحریروں پر "در جواب آں غزل" تفصیلی مقالے قلم بند کیے جو ان کے دوست مدیروں نے چھاپنے کی بجائے گم کر دیے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے نظریہ شعر و ادب کی بنیاد یہ تھی کہ انھیں اخلاقی اور روحانی بالیدگی کا حامل ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں:

"حسن عسکری جیسے عالم فاضل نقادوں کو بھی آخر آخر اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ ادب میں صالح جذبات کا اظہار اس کی مشرقی روح کا عکاس ہے۔ مغربی جدیدیت کی منجملہ خرابیوں میں سے ایک اس کی مادر پدر آزادی بھی ہے۔ میں اس قسم کے ادب کو روا نہیں جانتا۔"(۱۱)

حوالہ جات

۱۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، "انٹرویو" روزنامہ "جنگ" لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء، جریدہ کتاب
۲۔ نسیم غزل، مملوکہ سعادت سعید
۳۔ نسیم غزل، مملوکہ سعادت سعید
۴۔ نسیم غزل، مملوکہ سعادت سعید
۵۔ "انٹرویو" روزنامہ "جنگ" لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء
۶۔ "انٹرویو" روزنامہ "جنگ" لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء
۷۔ "انٹرویو" روزنامہ "جنگ" لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء
۸۔ مجلہ ساہیوال، گورنمنٹ کالج منٹگمری، ۱۹۶۹ء، ص ۳۵
۹۔ مجلہ ساہیوال، گورنمنٹ کالج منٹگمری، ۱۹۶۶ء، ص ۳۶
۱۰۔ الف۔ د۔ نسیم، مضمون "اردو کے منظوم قصے" مملوکہ سعادت سعید
۱۱۔ "انٹرویو" روزنامہ "جنگ" لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء

باب ہفتم

عقیدۂ راسخہ کی غزل

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی اردو غزل محبت کے اس سرمدی رشتے سے منسلک ہے، جس کے فروغ میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، اور میرزا مظہرؔ سے خواجہ میر درد تک کے شعرا نے حصہ لیا۔ امیر مینائی، بیدم شاہ وارثی، فانی بدایونی، امیر حیدرآبادی، آسی غازی پوری اور اصغر گونڈوی سے سید وحید السیما عرفانی اور بابا ذہین شاہ تاجی تک کے شعرا نے اس محبوب دل براں صنف سخن میں حسن و عشق کے ازلی و ابدی تصورات کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا۔ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" والی بات ہمارے شعرا کی تصوف اور اس کے متعلقات کے ساتھ ذہنی وابستگی کی غماز ہے۔ اپنے عہد کا رند مشرب شاعر مرزا غالب بھی خود کو ولی سمجھتا ہے (بائے بادہ خواری) ہے۔ تصوف ایک طرز زندگی ہی نہیں مقصد حیات بھی ہے۔ یہ انسانی قلوب و اذہان کی تطہیر کر کے اصل معنوں میں انسان کو جملہ رذائل سے پاک کرتا ہے۔

ہماری غزل کے ان شعرا نے جو کسی سلسلے کے تربیت یافتہ تھے اذہان و قلوب میں موجود برے خیالات کے منہ زور گھوڑے کو حد اعتدال پر لا کر شخصیت میں ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ دنیاوی جاہ و ثروت ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انھی موضوعات نے برصغیر کی فضاؤں میں مشترکہ تہذیب کی بنیاد رکھی تھی۔ پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق:

> اردو شاعری میں تصوف کی روایت سب سے زیادہ وسیع اور گہری رہی ہے۔ اس نے اپنی اصطلاحات اور رمز و ایما کے پردے میں انسان دوستی، رواداری، خدمت خلق، وسیع المشربی، اخلاقی بلندی اور قلبی طہارت پر زور دیا ہے۔ (۱)

آج کا انسان شعری زبان سمجھنے سے قاصر ہے، اسے قناعت، توکل اور استغنا سے کوئی علاقہ نہیں۔ کچھ صوفیانہ اشغال بھی اس بدگمانی کا سبب بن گئے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق کے عروج کے زمانے میں ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی اور نٹل

کالج لاہور سے انسلاک کے باوجود انھوں نے شعوری طور پر ان دونوں تحریکوں سے الگ راستہ اختیار
کیا۔ لاہور میں قیام کے دوران میں انھوں نے الگ سے ایک بزم ادب سجائی اور اس کے ہفتہ وار
تنقیدی اجلاسوں اور مشاعروں کا آغاز کیا۔ اس عمل کے پیچھے ان کے لاشعور میں موجود ان ساجی قدروں
کے تحفظ کا جذبہ شامل رہا ہوگا جو صدیوں سے موجود ہیں۔ ہماری کلاسیکی غزل کی بنیادیں بھی اسی روایت
پر استوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اپنی ذات میں گم ہو کر الگ سے راستہ بنانے کی کوشش ہمیں
فطری دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی اسی سلسلے کے فرد فرید ہیں۔ ان کی غزل میں صوفیانہ رجحانات کی بھرپور
ترجمانی ملتی ہے۔ ایک اور چیز انھیں اس سلسلے کے شعرا سے منفرد بھی کرتی ہے جسے ہم اقبال کی الوہی انا
کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ تصوف کی ایک لطیف روایت کے ساتھ ان کی شاعری میں اقبال کی فکری حرکیات
کی ایک طاقت ور لہر بھی تیرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ طریقت کا وہ راستہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانی کے
قول (ہر کہ مخالف شریعت است مردود است) کی فکری اتباع کرتا ہے۔ یہ فکر خانقاہوں سے نکل کر رسم
شبیری ادا کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ انھوں نے جس دور میں جوان ہو کر بھرپور زندگی کا آغاز کیا، اقوام
عالم دو بڑی جنگوں میں لگے زخم چاٹ رہی تھیں۔ صنعتی دور کے زیر اثر پاک و ہند میں بھی عقل پرستی
کا چلن عام تھا۔ الف۔ د۔ نسیم نے مذہب اور سے وابستہ اقدار کا دفاع اپنے ذمے لیا۔ وہ صدیوں
پرانی اس روایت کی حفاظت میں لگ گئے جو ناہنجاروں کے ہاتھوں پامال ہونے کے قریب تھی۔ اس موقع
پر ان کا جذباتی ہونا ہمیں فطری ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے ایک مضمون میں تفصیل کے ساتھ نسیم
صاحب کے اس دور کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ کہتے ہیں: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے جس زمانے میں
شعور کی آنکھ کھولی وہ متحدہ ہندوستان کی غلامی کا زمانہ تھا۔ فرنگی سیاست زوروں پر تھی۔ مسلمان زوال
آشنا تھے۔ مادی اور تکنیکی ترقی نے روحانی شعبوں کو سرد کر رکھا تھا۔ علت و معلول کی منطقی دست برد سے
بچنا کار محال تھا۔ دنیاوی عقل کے معاملات کو پذیرائی مل رہی تھی۔ ایمان اور عشق کے حوالے اہمیت کھو
چکے تھے۔ آتش نمرود میں عشق کے کود جانے کے واقعات کو پارینہ قصے گردانا جا رہا تھا۔ تشکیکی منطق
زوروں پر تھی۔ سرسید کے تتبع میں عقلیت پسندی کے راستے کو بنیادی اہمیت دی جا رہی تھی۔ نئے
سائنسی علوم کے رسیا از بایں ہر چیز کو تجربے کی کسوٹی پر پورا اتارنا چاہ رہے تھے۔ ایسے میں اس امر کی
اشد ضرورت تھی کہ عقلی اور فکری دلائل اور سائنسی شعور کی روشنی میں ایمان اور عقائد کے سلاسل کی

توجیہات کا رستہ اپنایا جائے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے نئے زمانے کے تناظر میں قدیم مذہبی عقائد کی تشریح و تعبیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ہر مینو ٹک کے جدید تصورات کے حوالے سے مذہبی متون اور شعری دانش کی عصری شرحوں سے سروکار رکھا (۴)

صوفیا کے نزدیک تصوف ایک کل ہے، اور اس کے اہم اجزا میں قرب خداوندی، فقر و فنا، حسن و عشق، فنا و بقا، تسلیم و رضا، انسان دوستی اور جبر و قدر وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر نسیم صاحب صوفیانہ محافل کے تربیت یافتہ تھے۔ کم و بیش اردو غزل کے یہی عناصر ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے شعری تصورات کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں موجود سادگی، استغنا اور بے نیازی نے انھیں ایک خاص ماحول فراہم کیا۔ ان کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جلوۂ یار عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ہر جگہ اُس کا نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کعبہ و دیر میں بے کار کیا اُس کو تلاش
وہ مری روح و رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
تمام عمر ملا پھر نہ اپنے گھر کا پتا
بتا گیا تھا کوئی مجھ کو اپنے در کا پتا
جہاں کہیں ہے کفِ پائے یار کی تصویر
وہاں سے لاتا تو اے شیخ میرے سر کا پتا

شاعری انسانی تخیلہ کی معراج ہے، مذاہب و عقائد میں عبادات سے متعلق اظہار کے زیادہ تر طریقے بھی شاعری کی طرح جذبہ، اخیال کے پابند ہیں۔ اظہار کی بلند ترین سطح پر مذہب، فلسفہ اور شاعری کا منتہائے مقصود ایک ہو جاتا ہے۔ شعر کی بنیادی چیز اگر جذبہ ہے تو مذہب کے پرستار کے پاس اس کے خارجی اظہار کی ایک صورت بت تراشی بھی ہے۔ اردو شاعری کا پس منظری ماحول مذہبی ہے، اس کا تلمیحاتی اور تشبیہاتی نظام خالص عربی اور ایرانی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم شاعری اور مذہب کے باہمی تعلق کے نہ صرف قائل ہیں بل کہ اسے دلائل و براہین سے ثابت بھی کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون "مذہب اور شاعری: چند تمہیدی مباحث میں کہتے ہیں:

مذہب اور اخلاقیات بھی آرٹ کی طرح واقعات اور اشیا کی ترجمانی ایسی طرز میں کرنے کی

کوشش کرتے ہیں جس سے ہم میں بھی ایک ہیجانی اور جذباتی کیفیت پیدا ہو تاکہ ہم ان کے مسلمات کے آگے بلا تامل سر تسلیم خم کر یں۔ مذہب جس کا مقصد ایک مکمل نظام کے تحت خدا یا اپنے سے برتر کسی اور ہستی کا ذہنی یا وجدانی ادراک ہے، شاعری کی طرح یا ایک حد تک جذبہ یا تخیل کا محتاج ہے۔ ایک آدمی جب مذہب کے دیگر فرائض حقوق سے الگ صرف خدا یا اس کے کسی اور مظہر (جسے وہ خدا سمجھتا ہے) کی ذات وصفات کے ادراک کی کوشش کرتا ہے تو لازمی طور پر اسے اپنی قوت متخیلہ سے کام لینا پڑتا ہے اور جب وہ اپنے خیال میں اس ہستی کا کوئی نہ کوئی نقش قائم کر لیتا ہے تو اس کے جذبات میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مناجات، دعا اور عبادات کے ذریعے کرتا ہے۔ (۳)

اردو شاعری کے اس متصوفانہ مزاج کے مختلف سلاسل کے زیر اثر فرد، سماج اور ادب خاص طور پر اردو غزل پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہماری غزل میں وحدانیت، مشاہدہ، رواداری، عشق، معرفت، توحید، نظریہ وحدۃ الوجود، عبادت، دنیا کی بے ثباتی، صبر، رضا، سیاحت، خرقہ پوشی، فقر، شریعت، طریقت، ریاضت، عبادت، ذکر، ہدایت، سماع اور انکسار جیسے موضوعات اسی کے تابع ہیں۔ تصوف کی دنیا میں محبوب کی وسعت آفاق پہ چھائی ہوئی آنکھیں دراصل چشم دل وا ہونے کی علامت ہیں۔ مست آنکھوں کا شراب خانہ طالب ومطلوب کے درمیان ایک الگ رشتہ قائم کرتا ہے۔ اس کی موجودگی میں کسی اور نشے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چشم محبوب عقدہ کشا ہے، بے قرار دلوں کے قرار کا باعث ہے:

می حاجت نیست مستم را
در چشم تو تا خمار باقیست

ڈاکٹر نسیم صاحب کی غزل میں حسن وجمال کی علامات کا یہی دل پذیر عنصر موجود ہے:

کس کا قرنے کھول دیے ہیں مست آنکھوں کے مے خانے
ذرہ ذرہ جھوم اٹھا اور رقص میں آگئے دیوانے

جس کی یاد میں آنکھوں سے اک خون کا دریا بہتا ہے
ایک وہی بے درد ہمارے دل کا حال نہ پہچانے

دل سے اتر کے پار جگر سے نکل گئی
تیغ نگاہ بھی کیا چال چل گئی

ہوا تھا دل میں جو پہلے ہی وار میں پیوست
ملا نہ پھر کبھی اس ناوک نظر کا پتا
پہلی نظر میں ہم نے تو سب کچھ لٹا دیا
بے زار جیسے بیٹھے تھے پہلے ہی زندگی سے ہم
گلشن میں ترا طالب دیدار ہوا تھا
اس بات پہ گل رہتا ہے خاروں میں نظر بند
جو چاند تاروں میں ضو فگن ہے جو پھول کلیوں میں جلوہ گر ہے
نگاہ مستی سے کوئی دیکھے تو تیرا ہی ہے جمال ساقی

چشم دل حسن ازل کا مشاہدہ کرتی ہے، یہ بصارت ازلی کی جانب اشارہ کرتی ہے، اگر خاص زاویے سے پڑے تو چہرے پر دائی عشق کے نقش ونگار بنا دے، جمال خداوندی تک رسائی دے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جس طرح ابرو کو آنکھ کی ہم راہی بالکل اسی طرح میسر ہے جیسے ذات حق اور مقام قوسین کا تعلق ہے۔

ابروؤں کا ایک اشارہ ہی حل المشکلات ہے:

یہ ہوش کس کو ہے کہ دیکھے حرام ہے یا حلال ساقی
تمھارے ابرو کا ہوا اشارہ میں نہ پیوں کیا مجال ساقی

زلف، کاکل اور گیسو کی صوفیانہ اصطلاح بھی طالب و مطلوب کے درمیان ایک عجیب رشتے کی نشان دہی کرتی ہے۔ یوں تو یہ جدا جدا ہیں۔ بقول ابراہیم ذوق:

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

زلف کی خوشبو محبوب تک رسائی کی علامت ہے۔ یا اگر چہرے کو چھپا لے تو انقباض کی کیفیات جنم لیتی ہیں، جیسے چاند بادلوں کی اوٹ میں آ جائے تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چہرے اور زلف ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

تیری زلفوں کی مہک آج بھی ہے یاد مجھے
منہ کے غنچے کی چٹک آج بھی ہے یاد مجھے

انجم کی ضو ، قمر کی ضیا ، مہر کی شعاع
نور رخ سحر ہے ذرا دیکھو تو سہی

ہیں جلوۂ محبوب میں خورشید و قمر بند
زلفوں میں اگر شب ہے تو ہے رخ میں سحر بند

بزم میں ساقی گلفام کی وہ تھا مژگاں
رزم میں نوک سناں تھا مجھے معلوم نہ تھا

ڈاکٹر صاحب کی شعری کائنات نعت شریف، غزل، رباعیات اور منقبت پر مشتمل ہے۔ انھوں نے دنیاوی فائدے کے لیے کبھی کسی صاحب ثروت وجاہ کا قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کے فکری و روحانی مرشد خواجہ میر درد کہتے ہیں ''فقیر کے اشعار باوجود رتبہ شاعری اور نتیجہ شاعری کے نتائج نہیں ہیں۔ فقیر نے کبھی شعر آورد سے موزوں نہیں کیا اور نہ کبھی اس میں مستغرق ہوا۔ کبھی کسی کی مدح نہیں کی نہ ہجو لکھی اور فرمائش سے شعر نہیں کہا'' (۳)۔ محمل صدر پر نسیم مرحوم کے قلم نے بھی یا تو بابرکت ہستیوں کی مدحت لکھی یا قوم کو علم و عمل کے راستے پر لانے کی سچی جستجو کی۔ انھوں نے اپنے اشعار میں قوم کو خودی کا تاج اور ذات کے عرفان کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔ انھوں نے خود بھی بامقصد زندگی گزاری اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کیا۔ وہ تصوف کے اس راستے کے سالک تھے جس میں دنیا کے سارے معاملات رنگ تجلی میں رونما ہوتے ہیں:

ہر شے میں جب صفات خدا کا ظہور ہے
ہر شے خدا نما نہ کہوں تو کیا کہوں

ہر سو وہ جلوہ گر ہے ذرا دیکھو تو سہی
وہ دعوت نظر ہے ذرا دیکھو تو سہی

کہتے ہیں شاہ رگ سے بھی ہے وہ قریب تر
نزدیک کس قدر ہے ذرا دیکھو تو سہی

میری وفا نے عمر بھر ان کا دیا ہے ساتھ
ان کی وفا تو ساتھ میرے چل کے چل گئی

رندوں نے لے لیا اسے نوک زبان پر
ساقی کے ہاتھ سے جو صراحی پھسل گئی

اس نقشِ پائے ناز پہ رکھا ہے جب سے سر
کیفیت سجود کی صورت بدل گئی

کہیں تصویرِ بتاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کہیں ناقوس کے سینے میں تھا فریاد کناں
کہیں آوازِ اذاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
تھا کہیں سلسلہ کوہ و جبل میں ساکت
کہیں دریائے رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
خندۂ گل تھا کہیں اور کہیں موجِ نسیم
کہیں بلبل کی فغاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

مسائل تصوف میں بت خانہ ،مے کدہ،دیر وحرم ،شراب ،پیر مغاں ،ساقی ،زنار ،ساغر ،صراحی اور پیمانہ وغیرہ مختلف مقامات ہیں۔دل ،بربیارہ صنم ،دوست اور محبوب وغیرہ معبودِ حقیقی کی تجلی صفاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب اس روایت کے خوب شناسا تھے۔انھوں نے صوفیانہ مصطلحات پر ایک شان دار کتاب بھی لکھی ہے۔صابری نور مصطفٰی کے خیال میں:

> ان (نسیم صاحب) کی غزل کا امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ انہیں فکر اور احساس کی ہم آہنگی کا رجحان ملتا ہے۔ان کے احساسات میں ایسی شدت یا طغیانی کا تاثر نہیں ملتا کہ فکر کو دبا دے اور فکری سطح او جھل کر دے اور نہ ہی فکر و خیال اتنے مجرد ہوتے ہیں کہ احساس کا تاثر ہی ختم ہو جائے۔فکر اور احساس کا اس حسین امتزاج نے انھیں منفرد غزل گو کی صف میں شامل کر دیا۔ایسا طرز عمل ہمیں بہت کم شاعروں کے ہاں ملتا ہے۔جہاں فکر اور احساسات کی ہم آہنگی مل کر غزل کی دل کشی ،لطافت ،رنگینی اور پر کیف مناظر میں اضافہ کر دے۔(۵)

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کے ہاں اسی نوع کی غزلیں ملتی ہیں جن میں ایک خاص قسم کی فضا ہے ،چند نمونے یہ ہیں:

ہے آمدِ فصلِ گل و لالہ کی بہت دھوم
ظالم مجھے اب کے تو نہ زنجیر میں کر بند

کچھ لطفِ چمن ہم کو بھی لے لینے دے صیاد
اڑتے ہی نہ کر طاقتِ پرواز کو پر بند
شاید ہے بہاراں میں مے ناب کی تاثیر
غنچوں نے جو مستی میں دیے کھول کر بند
اے موجِ نسیمِ سحری، مردہ زمیں سے
شاخوں پہ نکل آئے ہیں کتنوں کے جگر بند
جو پہنچے گرد کو اس کی خرد کی کیا ہے مجال
مقامِ عشق ہے بیروں ز حدِ وہم و خیال
وجود بحر پہ موقوف ہے حباب کی زیست
جو تو نہیں تو مری زندگی، عدم کی مثال
مقامِ سدرہ و طوبیٰ جہانِ ذات و صفات
ہے سارا عشق کا حاصل، ہے سب اسی کا مال
کمالِ آدمِ خاکی ہے ذات کا دیدار
مگر نصیب نہیں جز بہ ذوقِ مستی و حال
نقوشِ دہر میں بھرتی ہے رنگ ہر لمحہ
مری نگاہ تماشا بہ رنگِ ذوقِ جمال
خدا سے مانگ، دلِ زندہ، دیدۂ بینا
حذر ز دانشِ حاضر کہ ہے خودی کا زوال
درونِ میکدہ اس کا گذر نہیں ممکن
نسیمِ راہ نشیں بھی ہے کوئی صاحبِ حال
جوابِ خط کی تمنا رہی ہے اب کس کو
کوئی بتائے مجھے میرے نامہ بر کا پتا
خزاں کا دور بھی کتنا مقامِ عبرت ہے
نہ عندلیب کا ہے اور نہ برگِ تر کا پتا

ہوا تھا فصل بہاری میں جو اسیر قفس
تسیمؔ، لا تو بھی اس شکستہ پر کا پتا

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کے ہاں اہم شعرا کے لب و لہجے کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے خواجہ میر درد، میرزا اسداللہ خاں غالب اور علامہ محمد اقبال کی غزل کے رموز و علائم کے اچھے خاصے اثرات قبول کیے ہیں۔ ان کے شعروں کی لفاظی اور پیش کش بذات خود اس کا اعتراف کرتی ہے۔ ان کی غزل میں اقبال کے فکر و فلسف کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

حقیقت جذب و مستی کیا ہے؟ یہ اہل ہوش و خرد نہ جانیں
بساط عالم الٹ کے رکھ دے، جو رند ہو با کمال ساقی

مقام سدرہ و طوبیٰ جہاں ذات و صفات
ہے سارا عشق کا حاصل ہے سب اسی کا مال

کاروان عشق میں اب ایک بھی مجنوں نہیں
اور لیلیٰ بھی ہوس کے جام سے مدہوش ہے

میری زندگی کا حاصل میرا فقر کج کلاہی
نہ پسند آیا مجھ کو کبھی تاج و تخت شاہی

کہیں لامکاں سے آگے ہے نظر میرے جنوں کی
ہے غبار راہ منزل یہ جہان مرغ و ماہی

کسی مرد سے سبق پڑھ من عرف نفسہ کا
تو ہی کھیت تو ہی پانی تو ہی فصل تو ہی دانہ

جوز میں مسجد تھی اب تہذیب کا میخانہ ہے
مشرق و مغرب میں ہر جا شور نائو نوش ہے

علامہ اقبال کی طرح ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کے ہاں بھی عشق ایک متحرک قوت ہے جو کہیں روح الامین کا ہم راز ہے، کہیں اس کی پرواز طائر سدرہ سے بھی بلند ہے، عشق کے جملہ تصورات عام طور پر علامہ اقبال سے ماخوذ ہیں، ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کی غزل میں اردو کی صوفیانہ روایت کی پیروی کے ساتھ ساتھ اقبال کا تصور عشق بھی نمایاں ہے:

عشق ہے مطربِ ازل کا ساز
عشق روح الامین کا اعزاز
سدرۃ المنتہیٰ سے بھی ہے پرے
بے خبر مرغِ عشق کی پرواز
عشق سے آدمی کی خاک میں نور
عشق سے سنگ سنگ کوہِ طور
ماہ و انجم میں بھی ہے ظہور اس کا
ذرے ذرے سے عشق ہے مستور
خانۂ عشق قلبِ انسانی
شمعِ عشق ذاتِ نورانی
بازیِ عشق جنگِ بدر و حنین
شوکتِ عشق فقرِ سلمانی

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی غزل اردو کی کلاسیکی فضا میں آنکھ کھولتی ہے۔ یہ شاعری روایت کا تسلسل ہے، یہ ایک عارف کے مجذوبانہ مضامین ہیں، ایک صوفی کے افکار و تصورات ہیں، یہی اس غزل کی اہمیت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، "اردو شاعری میں تصوف کی روایت" مشمولہ مقالات تنقید و تحقیق، علی گڑھ، ادارہ تالیفات اردو، ۱۹۵۶ء، ص ۱۵۳

۲۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، دیباچہ "ارکانِ اسلام علامہ اقبال کی روشنی میں" ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم، ص ۶

۳۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، "مذہب اور شاعری" مشمولہ "نئی شاعری" شمارہ: اول، اگست ۲۰۱۶ء، مدیر ڈاکٹر سعادت سعید، لاہور، ص ۳۳

عبداللہ قریشی، محمد، "صحیفہ الکتاب: ایک مطالعہ" ماہنامہ "صریر" شمارہ ۱، سالنامہ ۱۹۹۳ء، مدیر: ڈاکٹر فہیم اعظمی، کراچی

۵۔ صابری، نور مصطفیٰ، "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرقی اقدار کی روشنی میں" غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۳۴

رباعیاتِ نسیم: ایک مطالعہ

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا شمار اردو کے اہم رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ "مجھے بے علم اذاں" کے عنوان سے زیر طبع ہے۔غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کی طرح رباعی بھی اردو کی مقبول صنف ہے۔رباعی چار مصرعے ہونے کے باعث ہیئت کے لحاظ سے قطعے سے مماثل ہے،اس لیے اکثر نوآموز دونوں میں تفریق نہیں کر پاتے۔قطعہ کسی بھی بحر میں کہا جا سکتا ہے، رباعی مخصوص بحر اور اوزان پر مشتمل ہوتی ہے۔یہ ایک دقیق اور مشکل صنف سخن ہے۔ابتدا میں رباعی کو حکیمانہ موضوعات کے لیے مخصوص کیا گیا لیکن اب اس میں متنوع موضوعات برتے جاتے ہیں۔رباعی لفظوں کی طلسم ہوش ربا ہے۔

اسی طلسماتی کشش نے رباعی کو باوقار اور منفرد صنف بنا دیا ہے۔آغاز سے موجودہ عہد تک جن شعرا نے تسلسل کے ساتھ رباعیاں لکھیں ان میں محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، خواجہ میر درد، میرزا محمد رفیع سودا، محمد تقی میر، مرزا غالب، مومن خان مومن، میر حسن، نظیر اکبرآبادی، میر انیس، میرزا دبیر، اسماعیل میرٹھی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فانی بدایونی، رشید لکھنوی، باقر مہدی، وحشی کانپوری، جگت موہن لال رواں، منیر شکوہ آبادی، یگانہ چنگیزی، شاد گورکھپوری، پنڈت جواہر ناتھ ساقی، جمال اویسی، عبید الرحمن، عاقد شبلی، شاد عظیم آبادی، تریش کمار شاد، عبد الرحمن احسان دہلوی، تلوک چند محروم، سرور جہاں آبادی، آرزو لکھنوی، امیر چند بہار، سید محمود الفقار، فرحت کانپوری، منظور حسین شور، شمس الرحمن فاروقی، فرید پربتی، عبد العزیز خالد، اکبر حیدرآبادی، نذیر بنارسی، ناوک حمزہ پوری، اختر انصاری، رضا علی وحشت اور اختر شیرانی کے نام اہم ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے رباعیات معریٰ کا تجربہ کیا ہے۔ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا نام بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی رباعیات اردو کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں لیکن تا حال

ان کا مجموعۂ رباعیات منظرِ عام پر نہیں آسکا۔ان رباعیات کی اہمیت کے باوجود شعرائے کرام اور ناقدین ادب ان کی طرف متوجہ نہیں ہوسکے۔ملک حمزہ پوری کے مطابق:

> ابھی پچیس تیس برس پہلے تک کا حال یہ تھا کہ رباعی گوئی سے جاتی ہوئی نسل کے باقیات صالحات کے زمرے میں شمار کیے جانے والے شعرا ہی کو شغف تھا۔نئی نسل کے شعرا جو نظموں میں اختصار کی خصوصیت اور اہمیت کے قائل تھے وہ بھی دوسری زبانوں کی بعض مختصر اصناف سخن کے عاشق جاں نثار ہوگئے اور رباعی کو دراز کار سمجھ کر اس کی ناقدر ہوگئے۔بعض وہ نامور شعرا جو بحیثیت متوشاعر بھی مشہور تھے کی جھولیاں رباعی سے خالی ہیں۔بعض لوگوں نے قابل تعریف راست بازی سے کام لیا اور لکھا کہ رباعیاں تو میں نے کبھی کہی نہیں۔بعض نے پانچ سات رباعی،بعض نے دس بارہ رباعی اور بیشتر نے بیس پچیس رباعی کہہ رکھنے کے جرم کا اقرار کیا۔(۱)

رباعی کا ایک مقبول موضوع سماجی اصلاح بھی ہے۔اسی وجہ سے یہ صوفیا،علما اور فلاسفہ کی مقبول صنف ہے۔اہل نظر کے خیال میں رباعی معاشرتی اور سماجی تہذیب کے لیے موثر ترین صنف ہے۔رباعی میں حکیمانہ مضامین بیان کرنے کی خاص مضبوط روایت موجود ہے۔الف۔د۔نسیم کی رباعیات میں بھی اصلاح احوال کی یہی صورت دکھائی دیتی ہے۔انھوں نے اپنی رباعیات کو سماجی اصلاح کے علاوہ عالمی سطح کے مسائل پر اپنے نظریات کی ترسیل کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ڈاکٹر الف۔د۔نسیم اشتراکی نظام کے ناقد ہیں تو سرمایہ داری پر بھی انھوں نے گہری چوٹ کی ہے۔نسیم صاحب کے خیال میں اشتراکیت فسطائیت کی پیداوار ہے۔یہ بظاہر مجبور و مقہور طبقے کی حامی ہے لیکن اس کا اندرون استبداد کا مددگار ہے:

نظام اشتراکیت بھی دیکھا
رخ سرمایہ داریت بھی دیکھا
کہیں قرآن سا دیکھا نہ دستور
جدا رنگ ملوکیت بھی دیکھا

نظام اشتراکی دام مزدور
ہے فسطائی روش کا خفیہ دستور
غریبوں بے کسوں کے نام پر ہے
جہاں بانی کا استبدادی دستور

فقیہ شہر کم علم اور بد نظر ہے، امور دین و دنیا سے یکسر نابلد ہونے کے سبب بوریا نشیں فقیروں کی زندگی بھی اسے راہبانہ لگتی ہے:

فقیہ شہر کج رو کج نظر ہے
نگاہ علم اس کی بے بصر ہے
بتاتا ہے فقیروں کو وہ راہب
رموز دیں سے کتنا بے خبر ہے

اہل سیاست کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

سیاست داں سے اللہ بچائے
ہنسے خود اور لوگوں کو رلائے
عام سادہ لوح پر مکر و فن سے
وہ ہر اک رنگ کا سکہ جمائے

نسیم صاحب نے نفس کے پجاری پیرزادوں کو بھی موضوع سخن بنایا ہے:

عطا جس کو ہوئی روشن ضمیری
امیری سے فزوں اس کی فقیری
بچا اس پیر سے جس کا ہے مقصد
اطاعت نفس کی دنیا امیری

انسان کو دیگر مخلوقات پر شرف حاصل ہے لیکن موجودہ زمانے کے مادیت پرستانہ علم نے اسے انسان سے شیطان بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر نے اس رباعی میں مادیت پرستی کے زیر اثر ہمارے نظام تعلیم پر خوب طنز کیا ہے، اس رباعی میں اکبر الہ آبادی اور علامہ محمد اقبال کے ہاں اہل کلیسا کے نظام تعلیم کے بارے میں موجود تصورات کا واضح رنگ ہے:

جو ہر مخلوق سے افضل تھا انساں
فرشتوں نے تھا چوما جس کا داماں
وہ علم عہد حاضر کی بدولت
بہ شکل آدمی ہے آج شیطاں

مضامین و موضوعات کے لحاظ سے رباعی کو حکمت و موعظت پر مبنی خیالات کے لیے مختص کیا جاتا رہا۔ اب اس میں وطن پرستی اور سیاست و سیادت کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ اس میں حسن و عشق کی شوخیاں بھی موضوع بنتی ہیں۔ رباعی کا موضوعاتی دائرہ اب وسیع تر ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی رباعیوں میں شعری رنگوں کا یہ تنوع دیکھیے:

بہ فیض مرغ آہ صبح گاہی
نمی شبنم میں لالہ میں سیاہی
گلوں کا سینۂ نازک شگفتہ
ہے سروپا بہ گل کی کج کلاہی

دل بے سوز بار جسم و جاں ہے
دل بے سوز سل ہے دل کہاں ہے
محبت اور مروت سے ہے خالی
دل بے سوز میں لذت کہاں ہے

زمین و آسمان و چار سو کیا
فضائے دشت و صحرا کاخ و کو کیا
نگاہ دیدہ ور ہو گر میسر
گلستاں کا طلسم رنگ و بو کیا

کہیں گرد و غبار زندگی ہے
کہیں حسن بہار زندگی ہے
کہیں نیت کی تشنگی ہے کہیں پر
کہیں تاب شرار زندگی ہے

ہمارے شاعر کی رباعیات میں شاعر کا ذاتی درد و کرب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ نسیم صاحب کی رباعیات میں بڑا پر تکلف انداز کے ساتھ اس کا رچاؤ موجود ہے۔ ایسی صدائیں جو دل کے نہاں خانوں سے ابھرتی ہیں اور کہیں فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ کائنات کے حسن بے پروا کے وہ جلوے جو رنگوں اور رعنائیوں میں ڈھل کر کہیں طاق نسیاں پر دھرے رہ گئے۔ فطرت کے دل کش نظارے جو زندگی کے مختلف مواقع پر آنکھوں کے سامنے ابھرے اور اب ان کی یادیں ہی کہیں یہ ماضی کا حصہ ہیں، لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کا پسندیدہ موضوع حسن ازل کو بے نقاب کرنا ہے۔ ان کی جستجو عام نہیں خاص ہے اور خاص اشیا کے لیے ہے، چند نمونے یہ ہیں:

سمندر کے کنارے پر پڑی خاک
تڑپتی اس کے اندر موج بے باک
ہے وہ افسردہ مردہ و بے کار
ہے یہ بے باک و چالاک و غم ناک

یہ دریا ہے مچلی کی تگ تیز
پس پردہ کوئی تو ہے شعاع ریز
سمندر میں جو ہے گرداب صورت
بگولہ بن کے صحرا میں ہوا خیز

خرد زناری بہت خانہ نفس
خرد از سراپا دیوانہ نفس
گلے مل مل کے جام و مینا روئے
پیا وہ عقل نے پیمانہ نفس

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی رباعیات تعداد میں کم سہی لیکن اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اردو رباعی کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ عزت اور احترام سے لیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ حمزہ فاروقی، ڈاکٹر: "اردو رباعی کا ارتقا" "سہ ماہی" "فکر و تحریر" شمارہ ۲۱، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء۔ مدیر: ڈاکٹر انیس شمیم، کولکاتا، ص ۱۲۲

ذکرِ شہِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کلامِ نسیم

نعت کا ہر شعر فکرِ انسانی کی معراج ہے۔ غزل جب باوضو ہو کر درِ حبیب پر حاضر ہوتی ہے تو نعت بن جاتی ہے۔ یہ محبوب و دل براں صنف ایسے نادیدہ جزیروں کی دریافت کا عمل ہے، جہاں اظہار کی اساس ہی صدق و مودت ہے۔ اسی صدق رس جذبے کے بطن سے پھوٹنے والی حضورِ رحمۃ للعالمین کے حضور گریہ کناں ہوتی ہے۔ یہ ایک دشوار گزار مرحلہ ہے، جس سے روحانی اثرات کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ نعت نبی معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے الفاظ و حروف کے ایسے محلات تعمیر ہوتے ہیں جہاں تصورات و نظریات کی دیگر سربہ فلک عمارتیں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ بڑے بڑے عقائد کے اس ہجوم میں "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" کی صورتِ حال وقوع پذیر ہوتی ہے۔ انسان کے اس نسلی ارتقا میں "جامعیتِ کبریٰ" صرف ایک ہستی کے ہاں ملتی ہے، جس کا اسمِ پُر انوار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس کی سرمدی بہاروں کا فیضان حقیقتِ محمدی ہے۔ کون و مکاں کی جلوہ آرائی میں کسی کو بھی درک تام نہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری و باطنی تصرفات کی حدود و قیود کا ادراک ممکن نہیں۔ ظاہر ہے جو ذاتِ اقدس ادراک و منطق کی سرحدوں سے ماورا ہو، جہاں قوسِ حضور انور عقلِ انسانی سر جھکائے کھڑی ہو، جہاں صورتِ محمدی کی پہچان اور حقیقتِ محمدی کی تفہیم عقول سے برتر ہو، وہاں اس بارگاہ تک رسائی کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

> "و در تحقیق معنی عظیم گفتہ اند کہ عظیم آنست کہ از حیطہ ادراک بیرون بود۔
> اگر محسوس است از حیطہ ادراک باصرہ بیرون بود و اگر معقول است،
> ادراک عقل بداں محیط نتواند شد پس چوں وے تعالیٰ۔ خلقِ آں حضرت را
> عظیم خواندہ و فقط کہ او زارِ عظیم گفتہ۔۔۔۔ احاطہ عقل از ادراک کنہ
> آں قاصر باشند"(1)

اگر کسی کو نبی ذی شان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام و مرتبے کا ادراک ہے تو وہ خالق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اللہ رب العزت سے بڑھ کر کوئی بھی رسول عربی کے منصب سے آگاہ نہیں۔ صرف ذات حق ہی مظہر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام کی اکملیت کا ادراک و عرفان رکھتی ہے۔ جیسے آپ، جناب سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی خالق کائنات کی تجلیات کے رازدار ہیں۔ سفر معراج اس کی مثال ہے جہاں شخصی بندگی کے ساتھ اوج کبریا کے باہمی تعلق کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور انسان کو شرف باریابی عطا ہوتا ہے۔ یہ صورت حالات، واقعات کی ایک شبیہ تو سامنے لاتی ہے لیکن اس کے اجزا سے اللہ اور رسول ہی واقف ہیں۔

ورفعنا لک ذکرک کے عشقیہ تناظر میں الفاظ و معانی کے سارے خراج نامے، عقیدت کے سبھی پھول اور شعر و سخن کے تمام قرینے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ آفرینش سے دنیا کی رہ گذر سے کم ہائی کا تذکرہ ہے نہ جانے کتنے انسانی قافلے گزرے جن کی شناخت پر ماضی کی گرد جم گئی، کتنی تہذیبیں اجڑیں تو ان کے ساتھ ان کے ناطق اور بانی بھی انسانی ذہنوں سے محو گئے اور یہ آتی اللہ اللہ اس کے جمال میں تو روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کی کل تحریک بڑھتا جا رہا ہے۔ تاریخ نے اس سے بڑا انصاف شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کیا ہوگا۔ مدحت شہ والا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی عمل عربی میں المدحۃ النبویہ بنا تو اردو میں اس کے لیے نعت کا لفظ معروف ہوا۔ میرے خیال میں ہر وہ شعر نعت ہے جو مقصد نبوت سے دل بستگی کا سامان پیدا کرے۔ اردو لغات میں 'نعت' کا لفظ مطلق وصف اور مدح رسول اللہ دونوں معانی میں آیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے معنی تو مطلق وصف کے ہیں لیکن اس کا استعمال صرف آں حضور کی ستائش و ثنا کے لیے مخصوص ہے حتیٰ کہ جدید لغات میں لغوی معانی غائب ہیں اور اصطلاحی معانی باقی رہ چکے ہیں۔

شعر و ادب کی دنیا میں ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کی علمی، ادبی اور تدریسی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے کون سا میدان ہے جس میں انھوں نے رنگوں کی گل کاری نہیں کی۔ غالب و مطلوب کی فکری فرہنگ نسی اگر ایک تھی تو حال پڑ گیا، رنگوں کے چھینٹے اڑے، بے تحاشا دریائے بہے۔ یہی معاملہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کا ہے۔ انھوں نے نعت کی صورت میں بہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقیدتوں اور محبتوں کا خراج نامہ پیش کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ یہ سعادت ہر کسی کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے۔ نسیم مرحوم کا نعتیہ کلام مطالعاتی، مشاہداتی، حضوری اور مہجوری کے سبھی مناظر کو یوں بہم کرتا ہے کہ حسن تخلیق کو اعتبار حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کو ایک نایاب دولت بھی

میسر آتی ہے۔ یہ دولت توفیقاتِ الٰہیہ کا انعام ہے جو ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتا۔ یہ اہلِ عشق
کے سچے جذبات کی عکاسی شاعری ہے۔ حسنِ عقیدت کے چند مناظر دیکھیں:

شعلہ زن رنگِ ممات نقشِ بربط حیات
سوز سکوت رنگ لب ساز نوائے خوش گلو
پردۂ طور میں بھی تھی جس کی جھلک بھر رہا
نور وہ تجھ سے ہم کلام چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
صد شکر اس میں رحمتِ عالم بھی آئے ہیں
کیا حال ورنہ ہوتا جہانِ خراب کا
دیکھو تو ان کے ایک اشارے کا دبدبہ
دم رک گیا تھا قبلِ غروب آفتاب کا
کہیں مطلوب سے طالب بھی جدا ہوتا ہے
جہاں محبوب خدا کا ہو، خدا ہوتا ہے

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے نظم و نثر کی مختلف اصناف میں الفاظ و معانی کے جواہر پارے تلاش کیے ہیں۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہوئے ان کے اصل جوہر دم نعت ہی کھلتے ہیں۔ تازہ کاری، آفاقیت، ندرتِ فکر، رعنائی خیال اور قرآن و سنت سے استفادہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی نعت کے وہ محاسن ہیں جو انھیں معاصر نعت گو شعرا سے ممتاز کرتے ہیں۔ خلوص اور پاکیزہ ذوقِ سخن کی حامل ہیں۔ ان میں داخلی و خارجی کیفیات بھی ملتی ہیں اور معاشرتی، اجتماعی اور کائناتی موضوعات و مسائل کا تذکرہ بھی ہے۔ کیفِ ہجراں اور اشتیاقِ زیارت و دیدار بھی ہے اور سلیقۂ مدحتِ سرکار بھی۔ سب سے بڑھ کے جو شے انھیں ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ سرکارِ مدینہ کے اتباع و تقلید کی دعوت، بارگاہِ رسالت میں استغاثہ، آشوبِ امت کا ذکر اور اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر فضائے عز و جل تک رسائی کا پیغام ہے، چند مثالیں:

آدمی کو کیا بنا دیتا ہے عشقِ مصطفیٰ ﷺ
علم و حکمت کو بھلا اس راز کی ہے کیا خبر
یہ اور بات ہے تو لب کشا نہیں ہوتا
رضائے حق تو ہے ورنہ تری رضا کے لیے

چوم لینے دے مجھے روضہ احمد ﷺ اے شیخ
جو بھلا کرتا ہے اس کا بھی بھلا ہوتا ہے

بے طاعت رسول طاعت نہیں قبول
میں نے سبق پڑھا ہے یہ ام الکتاب کا

تیرا قیام سر بسر وجہ قرار دو جہاں
تیرا کہو ہے گماں ارض وسما کی آبرو

میں بھی اے کاش پھروں شام وسحر شاد نسیم
روضہ سبز کے رحمت بھرے دالانوں میں

مدحت سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیاد چوں کہ حُبّ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی نعت میں فطری طور پر محبت اور عقیدت عود کر آئی ہے۔ ان کے ہاں موجود وارفتگی اور خود رفتگی کے جواہر دلیل ہیں کہ انھوں نے لفظ کی ثنا اور بحرِ عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شناور ہیں۔ یہی وصف ہے جو اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سہارے انھیں زیست کے بے آب وگیاہ صحرا میں بھی سفر جاری رکھنے کا تحرک بخشتا ہے۔ ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق سے پیدا کردہ "دردوغم" سے یوں سرسری گزرنا غیر مناسب ہے۔ اس کی شدت وحدت الف۔د۔نسیم کے اس مجموعۂ نعت کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ اس دور خرابی میں یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ہمارے پیارے شاعر کا نام اس ہستی کے مدح سراؤں میں شمار ہوتا ہے جس کے معترفوں میں اولین نام خود خالق کائنات کا ہے:

تیرا خدائے پاک نے ذکر بلند کردیا
صحرا بہ صحرا یم بہ یم قریہ بہ قریہ کوبکو

وہی دعوئی ایمان میں اپنے کامل
جو محمد ﷺ پہ دل وجاں سے فدا ہوتا ہے

سینہ کائنات میں کتنے پڑے ہوئے تھے چاک
سوزن فکر چارہ گر نے تری کردیے رفو

میرے ایمان کی بنیاد بہت سادہ ہے
جو ہے معبود محمد ﷺ وہ ہے میرا معبود

وہ مدینہ کا ہر ذرہ ہے دلِ عاشق
سنبھل سنبھل کے چلو چشمِ شوق کے قدمو

جس انجمن میں ذکرِ شہِ انبیاء ﷺ نہیں
اس انجمن میں ہم تو ہیں لیکن خدا نہیں

سراپا نگاری اردو نعت کی جامع خصوصیت ہے۔ حسنِ سرکار ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصویر کشی اور اسکے متعلقات کا دائرہ وسیع ہے۔ ظاہری پہلوؤں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سادہ بیانیہ اظہار شامل ہے لیکن اصل میں اس کے بطن میں چھپے ہوئے وہ جذبات اولیت رکھتے ہیں جو شاعر کے داخل میں حسن کے مشاہدے یا خیالی تصور کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے جلو میں ایک تصور لیے ہوتا ہے، اس لیے ذکرِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن و جمال کی مختلف زاویوں سے تفہیم قاری کے لیے اپنی الگ تاثیر رکھتی ہے۔ اس سے کسی شاعر کے ذاتی اور اجتماعی لاشعور کا ادراک بھی ممکن ہو پاتا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے نعت شریف میں شمائل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل پذیر تذکرے موجود ہیں۔ صابری نور مصطفیٰ کے مطابق:

> ان کی نعت اس حوالے سے بھی معتبر ہے کہ انھوں نے پختہ روایت میں رہ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سراپے کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان کی نعت محض عقیدت و احترام کا نام نہیں بل کہ اس میں تخلیقی حسن بہ درجہ اتم موجود ہے۔ حبِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کو بھی ملحوظ میں رکھتے ہیں اور عقیدت میں ان کی صفات کا تذکرہ کرتے وقت حمد اور نعت کے فرق کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ (۲)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی نعت میں سراپائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل کش صورتیں موجود ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

نسیم آتی ہے چھو کر زلفِ محمد ﷺ
نہیں ہے بے سبب پھول کلیوں کی مستی

جس کی ضیائے حسن کا سائل ہے تمام
جس کی شعاعِ نور کا محتاج آفتاب

اس کے قد اس کی قامت کے ہیں خوشہ چیں
سرو آزاد و شمشاد موزوں بدن
اس کے خورشید رخ سے ہیں سب فیض یاب
گل بدن، مشک بو، ماہ رو، سیم تن
"والنجم" تو اک روئے منور کی کرن ہے
"واللیل" میں ہے گیسوئے خم دار مدینہ
مجبور ہی پڑیں ملائک کی نگاہیں
ہے چیز عجب دیدۂ خونبار کا جلوہ
آئی صبا جو زلف محمد ﷺ چھو کے عبیر
غنچوں نے منہ چھپا کے کہا تو صبا نہیں
آئے گا بے خطا نظر جلوۂ ذات کبریا
دیکھ تو دیدۂ خرد مصحف روئے مصطفیٰ ﷺ

تنقید و تحقیق میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم مرحوم کی پسند کا میدان اردو شاعری کا کلاسیکی دور ہے۔ ان کا ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ معروف نقشبندی بزرگ حضرت خواجہ میر درد ؒ پر تھا۔ مقالہ تحریر کرنے کا داعیہ ان کی موضوعہ شخصیت (خواجہ میر درد ؒ) کی شخصیت سے عقیدت کی ابتدا کا محرک بنا۔ درد ؒ ایک نفیس اور وضع دار انسان تھے۔ ان کے سلسلے کے شعرا اپنا ایک مخصوص شعری لب ولہجہ تو رکھتے ہی ہیں، ان کا تخلص بھی ایک لطیف اور معطر احساس لیے ہوئے ہے۔ خواجہ میر (درد ؒ)، خواجہ ناصر (عندلیب ؒ)، حضرت میاں سعد اللہ (گلشن ؒ) میں درد، عندلیب اور گلشن کے ساتھ اسی روایت میں الف۔ د۔ (نسیم ؒ) کا اضافہ دراصل اسی پاکیزہ روایت کا تسلسل ہے۔ نسیم صاحب نے نعتیہ شاعری میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت کا اظہار مقطع میں اپنے تخلص کو اس کے اصل معانی کے ساتھ پیش کر کے انفرادیت حاصل کی ہے۔ نسیم سحر، نسیم رحمت، نسیم مشکیں، سوا دوش نسیم، نسیم خراماں، نسیم صبح، نسیم طیبہ، نسیم شوق، باد نسیم، نسیم بہار، نسیم سحری، موج نسیم، باغباں نسیم، نسیم کوئے طیبہ، نسیم ریاض مدینہ، نسیم جودہ وغیرہ کی تراکیب سے ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

چند مثالیں دیکھیں:

باغ میں گل ہی نہیں ہے چاک داماں اے نسیم
سینۂ بلبل میں بھی عشق نبی ﷺ کا تیر ہے

جس میں نسیم رحمت عالم ہے موج زن
اس گلشن مدینہ کی جانب نہ کیوں چلیں

پھولوں کے ساتھ شاخ پر آئے نظر جو خار
بولی نسیم یہ بھی ہے رحمت کی اک ادا

مدینے کے گلستاں میں یہ کس گل رو کی خوشبو ہے
نسیم شوق کا انداز ہے مستانہ مستانہ

نسیم طیبہ کی وہ بھی محتاج ہے کہ نہیں
ادھر سے گزرے تو فصل بہار سے پوچھو

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم عقیدۂ راسخہ کے شاعر ہیں۔یہ انتہائی حساس معاملہ ہے،آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور بے ادبی سے سانس لینا بھی اعمال کے ضیاع کا باعث ہے۔نسیم صاحب کے ہاں مؤدت کا یہ انداز اپنے پیرائے تراش لیتا ہے۔نعت کے اشعار میں ایک حسن توازن ہے۔حسن دراصل ایک ابدی سچائی ہے۔انسان کو فطری طور پر جمال پرست بنایا گیا ہے،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی بشریت کے جمالیاتی محاسن کی انتہائی تکمیل ہے،اس لیے ہر راست فکر شخص کے لیے ممکن نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال دل نشیں سے متاثر نہ ہو۔ہمارے نعتیہ ادب کی بنیاد حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی محبوبیت پر رکھی گئی ہے۔نسیم صاحب کی نعت میں محبت ومؤدت کا یہ متوازن انداز واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔کسی شاعر کے نعتیہ اسلوب کی پرداخت میں اس کا تاریخی اور سماجی ماحول بھی وافر اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہاں ڈاکٹر صاحب زادہ ابو الخیر احمد ندیم کی بات اہم ہے:

"نعت سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال وکمال اور جود ونوال کا شعری بیان بھی ہے۔سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہ طور امتی نعت گو کی والہانہ محبت وعقیدت،تعظیم وتوقیر اور اسوہ وسیرت کے حوالے سے نعت گو کے مؤقف کا اظہار بھی ہے،اس کی اعتقادی جہت ایمان بالرسالت اور اس کے تقاضوں کا اظہار ہے اور اس کی دوسری جہت احساسات وجذبات اور کیفیات

واحوال کے اس والہانہ پن کا جمالیاتی اظہار ہے جو نعت گو تعلق بالرسالت کی جہت سے محسوس کرتا ہے۔ گویا ایک نعت کا اعتقادی Metanarrative جو قرآن وسنت اور اسوۂ رسالت کی تعبیرات و تفہیم کے عمل میں اسلامی ثقافت کے تاریخی اظہار کے نتیجے میں تشکیل پایا اور ایک نعت کی جمالیاتی اور شعریاتی جہت ہے جو طرزِ احساس اور جذبہ وخیال کے باہم درآویزدروبست سے تشکیل پاتی ہے۔ اس میں نعت گو کی انفرادیت اس کے عصر کا مجموعی طرزِ احساس اور اس کا سماجی، ثقافتی، سیاسی، روحانی، فکری، اخلاقی، روحانی، فکری، خلاقی اور جمالیاتی عناصر کی آمیزش ہوتی ہے جس سے نعت گو کی شخصیت تشکیل پاتی ہے"(۳)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی نعت بھی کم وبیش ہماری چودہ سوسالہ روایت سے فروغ پاتی ہے۔ ان کے ہاں نعت کے کچھ متنوع موضوعات دیکھیے:

نور سے تیرے تابناک چہرۂ عرش وروئے فرش
حسن سے تیرے دل نشیں نقش ونگار رنگ وبو
صورت اذان سے کھلا باب حضوری خدا
طرزِ نماز نے کیا حسن ازل کے روبرو
ہوئی تکمیل نبوت بہ ظہور احمدﷺ
آتے آتے ہی کسی شے میں کمال آتا ہے
عشق نبیﷺ ہر ایک کو ہوتا نہیں نصیب
اے دوستو یہ خوبی قسمت کی بات ہے

مدینہ منورہ شہرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، یہی اس کی عظمت کا سبب ہے۔ یہ وہ مقدس بستی ہے جہاں شاہ وگدا سب برابر ہیں۔ جنیدؒ و بایزیدؒ جیسی ہستیاں بھی یہاں سر جھکائے حاضر ہوتی ہیں۔ یہ شہر بھی فانی ہے لیکن اس کے ابدی مکین نے مدینہ کو ابدی حیثیت دی ہے۔ ہمارے شعرا میں حضرت علامہ اقبالؒ کے ہاں "ثنا خانۂ حجاز" اور اس نوع کی چند اور نظموں میں فکر و فلسفے کی گہرائی کا ساتھ اس کا باقاعدہ اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا شمار بھی بنیادی طور پر معتقدین اقبالؒ میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی شہرِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے مقامات (مثال کے طور پر روضۂ

انور، بقیع، واحد، گنبد خضریٰ) سے عقیدت ظاہر ہوتی ہے:

سجدۂ شوق ترا آج مقدر جاگا
دیکھ وہ روضۂ سرکار نظر آتا ہے
آؤ مدینے جاکے بسر زندگی کریں
یارو عجب مزہ ہے وہاں صبح وشام کا
راہ طیبہ کی پکڑتا کوئی لمحی یارو
وصل سے بڑھ کے جدائی کا مزا ہوتا ہے
عمر کے کو گیا عشق مدینے پہنچا
شکر ہے دونوں طرح قرض ادا ہوتا ہے
نفس نفس ہے مرا یاد طیبہ سے معمور
تمھیں تو ساری خبر ہے پرانے ہم نفسو

ایک نعت (جس کا ردیف مدینہ ہے) کے چند اشعار دیکھیں:

ہوئے جب محمد ﷺ مکین مدینہ
فرشتوں نے چومی زمین مدینہ
کوئی نور تو اس میں چمکا ہے ایسا
ہے آئینۂ حق، جبین مدینہ
نبوت کی انگشت میں ہے جو خاتم
لیے ہے وہ در نگین مدینہ
نسیم محبت نے پالا ہے اس کو
ہے جو گل بھی جاگزین مدینہ

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید کہتے ہیں:

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کے نعتیہ مزاج میں فارسی اور اردو، دونوں روایتوں کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ نعت گوئی میں فارسی شعرا میں سے مولانا جامی، شیخ فریدالدین عطار، حکیم سنائی اور اردو شاعروں میں امیر مینائی، علامہ اقبال اور حفیظ تائب سے متاثر تھے۔ ان کی نعت کے الفاظ ومعانی ومفاہیم

اور مضامین و اسالیب میں تخلیقی روح جلوہ گر ہے۔ان کی نعت میں شاعرانہ ہنر مندی، مہارت، کاریگری،
خلوص، والہانہ عشق، سوز و گداز اور عقیدت جیسی خوبیاں نمایاں ہیں۔"(۳)

ڈاکٹر محمد عالم خان ان کی نعت کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں:

(ڈاکٹر عالم خان) ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی نعتیہ شاعری میں فکری موضوعات کا تنوع ہے۔ انھوں نے جس رجحان کی عکاسی اپنی نعت میں کی ہے، وہ عصری حالات کا تقاضا تھی۔ برصغیر میں نمو پانے والی نعتیہ روایت کا تسلسل ان کی نعت میں دکھائی دیتا ہے۔ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ "نسیم طیبہ" ننانوے نعتوں پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی ناموں کی نسبت سے اتنی تعداد رکھی۔ان نعتوں میں جہاں جوش، عقیدت اور محبت کی انتہا ہے وہاں ملت اسلامیہ کے مسائل کا تذکرہ بھی ان کا موضوع بنتا ہے(۵)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اردو نعت کی روایت سے وابستہ اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو کے نعتیہ سرمائے میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اسے نئے تجربات سے آشنا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ساجد امجد، ڈاکٹر: "اردو شاعری کا تہذیبی اور ترقی پسند منظر"، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۴۳۳

۲۔صابری نور مصطفیٰ: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرقی اقدار کی روشنی میں"، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۹۲

۳۔صاحبزادہ احمد ندیم، ڈاکٹر: "اردو نعت کے نئے زاویے"، مشمولہ "نعت رنگ"، ۲۰۱۱ء، مدیر سید صبیح رحمانی، کراچی

۴۔صابری نور مصطفیٰ: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرقی اقدار کی روشنی میں"، ص ۲۶

۵۔ایضاً، ص ۲۹۳

باب ہشتم

مشاہیر کی آرا

ڈاکٹر سلیم اختر

"ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ساتھ میرا پرخلوص تعلق خاصے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ گورنمنٹ کالج ملتان میں تبدیل ہو کر آئے تو اس وقت وہ ہمارے صدر شعبہ بنے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے جس محبت سے نوازا میں اس سے بہت متاثر ہوا اور آج تک ان کی شفقت کو نہیں بھول پایا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان ہیں، ان کے دل میں ہر ایک کے لیے خلوص اور محبت کے جذبات ہیں اور انھوں نے یہ جذبات لٹانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ جب بھی شعبہ میں کسی طرح کی کوئی تنگی کی صورت پیدا ہو جاتی یا ذاتی حیثیت میں ہمیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اسلوبی سے اسے سلجھا دیتے۔ قلیل عرصہ میں ہی انھوں نے بطور ایک ہر دل عزیز استاد اور پرخلوص دوست کے کالج اور ملتان میں خصوصی شہرت حاصل کر لی۔ ان دنوں کالج میں ایم۔ اے اردو کا اجرا ہو چکا تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی ایم۔ اے ہی کو پڑھاتے تھے۔ یہ ان کے انداز تدریس کی خوش اسلوبی تھی کہ مشکل سے مشکل ادبی اور تنقیدی مسئلے کو وہ نہایت آسانی سے طلباء کے ذہن نشین کروانے میں کامیاب رہتے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے واقعی ایک مثالی استاد تھے اور ان کے جانے کے بعد بھی ان کے شاگرد ان کو محبت سے یاد کرتے تھے ان کا گھر ساہیوال میں تھا اور وہ تبادلے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے چنانچہ کچھ عرصہ میں وہ واپس ساہیوال چلے گئے لیکن جاتے جاتے کالج میں اپنے طلباء میں اور ہم دوستوں میں اپنی محبت کی خوشبو چھوڑ گئے۔"

پروفیسر میاں محمد مرغوب

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کلاسیکل لٹریچر پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ جب وہ کسی موضوع پر لکھتے ہیں یا گفتگو کرتے ہیں تو حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ۲۹ سال

طویل تعلق کے بعد میں ان کی جن صفات سے متاثر ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ فقر، درویشی، قناعت اور خوئے دل نوازی سے مالا مال ہیں۔ آج کے دور میں بھی وہ حرص و ریا، مکر اور جلبِ منفعت کے عیوب سے پاک ہیں۔ ان کے نظریات واضح اور دوٹوک ہیں۔ کسی شخص سے ان کی دوستی کسی دنیاوی غرض پر مبنی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے سولہ سال پہلے سرکاری مصلحتوں سے نجات پانے کے بعد بھی عام لوگوں اور طلبہ (جو براہ راست ان کے دامن گرفتہ ہیں یا ان کو جانتے ہیں) میں ان کو بے پناہ عزت حاصل ہے اور آج بھی وہ شہر اور بیرونِ شہر میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ یقیناً ان کا خلق میں شرفِ قبول اخلاص اور اندرونی روشنی کا نتیجہ ہے۔ اس کی اصل وجہ ان کی قناعت اور درویشی ہے۔ بقول آتش

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

پروفیسر صابر لودھی

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم میں انسانوں والی عادتیں کم اور فرشتوں والی زیادہ ہیں۔ وہ "زیادہ محنت" کے قائل نہیں اس لیے فرشتہ بنے رہنے پر ہی قانع ہیں۔ اردو کے تمام شاعروں کو چھوڑ کر انھوں نے نوجوانی میں خواجہ میر درد سے ذہنی رابطہ قائم کیا اور ان ہی کے ہو رہے۔ درد مند انسان اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور کیا کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ان کے محبوب استاد تھے۔ درد کے مسلک سے انھوں نے ہی نسیم صاحب کو آشنا کیا تھا اور خود میر کی تقلید کی تھی۔ کیوں کہ میر درد کا مسلک اپنا کر حجرہ نشیں اور بوریا نشیں ہونا پڑتا ہے یہ ہمت الف۔ د۔ نسیم میں تھی۔ چناں چہ درد کی محبت اور ان کے پیغام کو انھوں نے اپنے دل میں اتار لیا۔

ڈاکٹر خورشید رضوی

میں نے ۱۹۵۵ء میں جب گورنمنٹ کالج منٹگمری (اب ساہیوال) میں سالِ اول کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا تو بڑے بڑے جید اساتذہ یہاں درس و تدریس میں مشغول تھے۔ پروفیسر ا۔ د۔ نسیم صاحب شعبہ اردو کے سربراہ تھے۔ گورے چٹے، قد مائل بہ درازی، سوٹ بوٹ، نکٹائی سے درست، داڑھی صاف، مونچھیں اور بال سیاہ اور چمک دار، چال میں ایک دل آویز متانہ کیفیت۔ میں

چوں کہ اردو کا طالب علم نہیں تھا اس لیے ان کی باقاعدہ شاگردی کا شرف حاصل نہ تھا۔ سال ڈیڑھ سال انھیں دور دور ہی سے دیکھا۔ سال سوم میں آتے آتے شعر و ادب سے دل چسپی کے باعث کالج کی مجلس ادب اور مشاعروں میں شرکت رہنے لگی تھی۔ انھی محفلوں میں پروفیسر صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں کالج کے مجلے "ساہیوال" کے نگران بھی وہی تھے۔ میں نے غالب کی زمین میں ایک مبتدیانہ سی غزل کہی جسے انھوں نے "ساہیوال" میں جگہ دے دی۔ بی۔ اے کے بعد میں لاہور چلا آیا اور پھر بہت طویل عرصے تک ساہیوال سے رابطہ منقطع رہا۔ کم و بیش چالیس برس کے بعد جانا ہوا تو پروفیسر صاحب کے دردولت پر بھی حاضری دی۔ ان کا بڑھاپا بھی بہت دل "موہ" نظر آیا۔ حافظہ اور ذہنی قویٰ قابل رشک تھے، بہت محبت سے ملے۔ اب ان کا غالب رجحان تدین اور تصوف کی طرف ہو چکا تھا تاہم یارباشی اب بھی کم نہیں تھی۔ آخری بار ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ یہ وہ موقع تھا جب ان کے ایک فرزند انتقال کر گئے تھے اور میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اس بار صدمے کے اثر سے وہ خاصے کم زور اور مضمحل نظر آئے۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ کچھ ہی عرصے میں خود بھی انتقال فرما گئے۔ پروفیسر ارد نسیم اساتذہ کی اس کھیپ سے تعلق رکھتے تھے جن کی طبیعت میں اعتدال، رواداری، فراخ دلی، وسیع المشربی، علم دوستی اور ادب کا ذوق جیسے اوصاف ایک دل کش امتزاج کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ ان کی شفقت اور محبت کا نقش دل پر ہمیشہ باقی رہے گا۔

پروفیسر سید محمد اکبر

ڈاکٹر صاحب کے معتقدات خالص تھے اور ان کے طرز حیات کا رخ متعین تھا۔ وہ عشق کو عقل و دل نگاہ کا مرشد اولین جانتے تھے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ تصوف ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ بڑے پروقار انداز میں شریعت و طریقت کی پاس داری اور معاشرتی و سماجی مثبت رویوں کا احترام کرتے تھے۔ احترام انسان ان کے ہر رویے سے ظاہر ہوتا تھا۔ انھیں حقیقت و مجاز کے حسین امتزاج سے سادہ و سہل حکیمانہ پیرایہ اظہار میں انسانی و نفسانی، نفسیاتی و جذباتی معاملات و کیفیات کو پرمعانی و دل چسپ حکایات کے ذریعے جالسین مجالس کو مستفید کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ دلیرانہ وقلندرانہ اوصاف سے باخبری نہیں متصف بھی تھے۔

ناصر شہزاد

جب میں نے کالج میں سال اول میں داخلہ لیا تو ہمارے اردو کے استاد ڈاکٹر نسیم تھے۔ وہ ایک باکمال شخصیت کے مالک انسان تھے۔ آپ کی شاعری پر کلاسیکی اساتذہ کی غزل کے اثرات تھے۔ ایک بااصول اور بااخلاق لیکن قدرے جذباتی انسان۔ ایسے کہ بے اختیار ان سے محبت کرنے کو جی چاہے، برتے تو غصہ بن جائے۔ ایسے لوگ اب دنیا میں بہت کم کم ہیں۔

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی

"ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم گورنمنٹ کالج ساہیوال سے تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم۔ اے اردو کی تدریس کے لیے بطور خاص بھیجے گئے تھے۔ میرے ساتھ خوش بختی کا اظہار یوں ہوا کہ گل گشت کالونی کی "ہاشمی ہاؤس" میں ایک ہی کمرہ میں مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہائش پذیر ہونے کا اعزاز بے پایاں حاصل ہو گیا یوں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے، ان کے اطوار کو پرکھنے ان کے اندر جھانکنے، ان کے افکار کو کھنگالنے اور ان کے عقائد و نظریہ کا بے لاگ جائزہ لینے کے قیمتی لمحات میسر آ گئے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کی تصویر دل پذیر تھے وہ ہر موضوع پر بڑے سچے تلے اور انوکھے انداز میں لب کشائی کرتے، معلومات کا بحر زخار سامعین و ناظرین کو مبہوت کیے رکھتا۔ سمندر سے گہر ہائے آب دار ہمارے ہاتھ لگتے ڈاکٹر صاحب کی گفتگو ہمیں گرامی قدر کتب سے بے نیاز کر دیتیں ان کے تبصرے اس قدر جامع اور سیر حاصل ہوتے کہ مزید حاشیہ آرائی اور وضاحت کی ضرورت نہ چھوڑتے۔ میں دیانت داری سے محسوس کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب جیسا شفیق، علیم، حلیم اور کریم استاد نایاب بھی تھا اور گنج ہائے گراں مایہ بھی۔ ان کی ہر بات نہایت طبع زاد، فکر افروز اور شگفتہ ہوتی تھی ان کی تخلیق، ان کی تنقید بشاش بشاش اور تر و تازہ روپ عطا کرتی تھی۔ وہ خواجہ میر درد کی ہم ذوق ہیں، اقبال کی وسعت نظری ان کی ہم جلیس، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اردو دوستی ان کی ہم رکاب، مولانا صلاح الدین احمد کی ملک دوستی ان کی ہمدم اور اسلامی و ادبی میلانات کی سربلندی ان کا مطمح نظر ہے گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم سلف صالحین کی یادگار ہیں ان کی تحقیق دل کی تفسیریں ہیں اور ان کا دل مرقع محبت ہے یہ محبت طیبہ کی خوشگوار فضاؤں سے معطر ہے۔ وہ جس طرح گھر کی چار دیواری میں مجسمہ علم و شرف ہیں حلقہ یاراں میں بھی ہر لمحہ شیرینیاں بانٹتے، خوش گفتاریاں بکھیرتے اور دل نوازیوں کی سوغاتیں تقسیم

کرتے ہیں۔ میں نے ان کی تحریر اور ان کے عمل میں کوئی تضاد نہیں دیکھا جو لکھتے ہیں اس کی تفسیر ان کا عمل کرتا ہے وہ امتر گونڈوی کی طرح اپنے ظاہر اور باطن کو چھپاتے نہیں بلکہ جس نے دیکھا ہے خوب دیکھا ہے، جیسا لکھتے ہیں ویسا کرتے ہیں کے مصداق ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم جیسا ہم جہت انسان نایاب بھی ہے اور گوہر بار بھی۔

ڈاکٹر نیر صمدانی

جب میں نے گورنمنٹ کالج ساہیوال میں داخلہ لیا۔ اس وقت جن اساتذہ کرام سے پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ اپنی قابلیت، ذہانت، نظافت اور تدریس کے حوالے سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ لیکن خصوصاً ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ نسیم کی شخصیت ناقابل فراموش ہے وہ عموماً دھیمی آواز میں گفتگو کرتے لیکن موضوع کے اعتبار سے ان کے لہجے میں اتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتا۔ ڈاکٹر موصوف شعر کی تشریح بہت ہی وضاحت سے کیا کرتے تھے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں ان کی تشریح کرنے کا انداز شعر کو زیادہ خوبصورت بنا دیتا تھا۔ ایک بات مجھے یہ محسوس ہوتی تھی جیسے علم و عرفان کی بے خودی کا ایک ہالہ سا ہے جو ان کی شخصیت کا طواف کرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ نسیم خوبصورت تھے، خوبصورت لباس پہنتے اور خوبصورت گفتگو کرتے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ نسیم ہمارے علم و ادب کی روایت کے ایک روشن ترین کردار ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ارکان اسلام اور کلام اقبال میں ہم آہنگی تلاش کرتے ہوئے کئی ایسے دیگر بنیادی موضوعات کا بھی شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا ہے کہ جن کے بارے میں جاننا دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے افراد کے لیے امر لازم ہے۔ اسلام کیا ہے؟ دین کا مفہوم کیا ہے؟ ایمان کسے کہتے ہیں؟ مومن کی صفات کیا ہیں؟ اور مسلمان کون ہے وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے تناظر میں اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کی نوعیتوں اور کلمہ طیبہ کی علمی، عملی اور صوفیانہ صورتوں کا ایک مفکر اور عالم کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے تصوف کی نظری اور فکری بصیرتوں کی روشنی میں تصور توحید کی متنوع جہتوں کی نشاندہی کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں توحید، وحدۃ الوجود، شرک، حق و باطل، تسلیم و رضا، استمداد غیر اللہ، ملکیت، جہاد، خودی، علم، اخوت و مساوات،

فرقہ بندی، تقسیم شعوب و قبائل، وطنیت، صلح کل، خوف و حزن، فرد و جماعت، جان و تن، عینیت، شریعت و طریقت، وحدت دین و دنیا، ضبط نفس، سیاست، استغنا، قوت، فطرت، خود انحصاری، فنون و ہنر، اقدار خیر و شر، مسئلہ جبر و قدر، تقلید، پابندی آئین الٰہی، فقر و فقیری، ترک دنیا، فقر و سلطنت، عدل و احسان اور آزادی کے موضوعات کو کلام اقبال کے فلسفیانہ اور شاعرانہ حوالوں سے مزین کر کے پیش کیا گیا ہے۔

قاضی ظفر اقبال

ڈاکٹر صاحب نے ایک لیکچر دیا، آپ نے اقبال کے ایک شعر سے بات شروع کی، یہ گفت گو ڈیڑھ گھنٹہ چلی، آپ نے خودی کے مختلف مراحل و مدارج بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے حوالے سے اقبال کے نظریہ اجتہاد پر بھی روشنی ڈالی، ڈاکٹر صاحب نے علم کے بحرِ ذخار میں خوب خوب غواصی کی۔ بہت سے لولوئے لالہ سطح پر اچھالے۔ آپ فرط جذبات سے کبھی آنکھیں بند کرتے اور کبھی کھول لیتے، جب اقبال کے حوالے سے عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر آتا تو نہ صرف آپ کی آواز بھرا جاتی بلکہ آپ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے استاد، ایک صاحب نظر اقبال شناس اور سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

افتخار جاوید

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم اردو کے واحد ادیب ہیں جنہوں نے مذہب اسلام کے بارے میں بہت ساری کتب لکھیں جن میں سیرت نبوی پر دو کتابیں حیات النبی ﷺ اور محسن ﷺ بھی شامل ہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ اس کے علاوہ ہے جس کا نام نسیم طیبہ ہے۔ ان کا اصل کام اقبالیات کے متعلق الگ ہے جن میں اقبال کا فن شعر مسجد قرطبہ کی روشنی میں، اقبال ہمہ جہت شخصیت، اقبال اور ارکان اسلام، اقبال اور مسئلہ وحدۃ الوجود جیسی تصنیفات شامل ہیں مگر معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ ان کا اصل افتخار اقبال کے سارے فارسی کلام کی تشریح و توضیح ہے۔ اقبال نے زیادہ لکھا بھی فارسی میں سو اس کلام کی معرفت ہمارے جیسے اردو دان طبقے کے لیے اور ضروری تھی۔ اقبال کی کوئی ایسی فارسی کتاب نہیں جس کی تشریح انھوں نے نہ کی ہو۔ انھوں نے تمام فارسی کلام کا ترجمہ بھی کیا اور ساتھ مطالب بھی لکھے۔

پروفیسر حق نواز

"ڈاکٹر صاحب اُردو ادب کے بہت بڑے ادیب اور محقق ہیں۔ انھوں نے خواجہ میر درد کے تصوف پر ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی، میری ان سے ملاقات ۱۹۶۱ء میں ہوئی جب میں لیکچرار ہو کر انھی کے ماتحت گورنمنٹ کالج ساہیوال میں تعینات ہوا وہ شعبہ اُردو کے صدر تھے۔ اُردو ان کی کمزوری ہے اُردو سے محبت کا اظہار انھوں نے بے شمار موقعوں پر کیا ہے مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب کہ حکومت نے ایف۔اے کے نصاب میں اُردو کی لازمی حیثیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی آواز اخباروں رسائل کے علاوہ خطوں کے ذریعہ بھی عوام تک پہنچائی۔ یہ انھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ایف اے میں اُردو لازمی اپنی جگہ پر رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ شعرا میں خواجہ میر درد تو ہیں ہی اقبال سے ان کی محبت کا ذکر نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔

شکیل قمر

ڈاکٹر اے ڈی نسیم مرحوم کے بارے میں کہنا "سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ میرا ایک انتہائی دلچسپ سبجیکٹ یہ ہے کہ "دنیا میں زیادہ تر لوگ اچھے انسان نہیں ہیں اور بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو بہت اچھے انسان ہیں" ایسے ہی اچھے انسانوں میں ڈاکٹر اے ڈی نسیم صاحب بھی شامل ہیں، گورنمنٹ کالج ساہیوال میں طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر اے ڈی نسیم صاحب میرے بھی اُستاد رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اُن کی شاگردی میں بہت کم وقت میسر آیا کاش یہ وقت لامتناہی ہوتا اور میں ڈاکٹر اے ڈی نسیم صاحب جیسے عظیم انسان سے اور زیادہ فیض یاب ہو سکتا۔ ڈاکٹر اے ڈی نسیم صاحب کی عظمت کی گواہی صرف میں ہی نہیں دے رہا بلکہ لاکھوں لوگ ہزاروں طالب علم اور بے شمار اُن کے رفقائے کار اس بات کے گواہ ہیں کہ ڈاکٹر اے ڈی نسیم صاحب مرنجان مرنج انسان تھے انتہائی مخلص اور اپنے پیشے سے محبت کرنے والے، ادیب، شاعر، مقرر اور اپنے شاگردوں سے دلی محبت کرنے والے انسان تھے اللہ کریم اُن کے درجات بلند فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

واصف سجاد

اردو زبان اور علامہ اقبال کا ڈاکٹر اے ڈی نسیم سے بڑھ کر عاشق میں نے نہیں دیکھا۔ اردو زبان کو اس

کا جائز حق جو 1973 کے آئین میں درج ہے دلوانے کے لیے انھوں نے اپنے شاگرد اور ہمارے استاد محترم پروفیسر میاں محمد مرغوب کے تعاون سے حکومتی ایوانوں کو جھنجھوڑا۔ یہ بزرگ اپنے حصے کے دیپ جلا کر چلے گئے۔ مگر اردو کی بازاوری ہمارے ارباب بست و کشاد کو منظور نہیں۔ کتنی ہی یادگار شامیں ڈاکٹر صاحب کی قربت سے استفادہ کرتے ہوئے گزریں۔ ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی و تنقیدی کام اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور ان کی علمی و ادبی مساعی نے ساہیوال شہر میں علمی بنیادوں کو استوار کیا۔

ڈاکٹر مشتاق عادل کا لھیا

ساہیوال کی سرزمین علم و ادب کے حوالے سے خاصی زرخیز ہے۔ قانون قدرت ہے کہ بغیر ہل چلائے اور بیج بوئے زرخیز زمین سے بھی کچھ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ ساہیوال میں علم و ادب کی آبیاری کرنے میں جن شخصیات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم سرفہرست ہیں۔ انھوں نے اس عہد اس خطے کے اہم ترین تعلیمی ادارے سے منسلک ہو کر ایک عظیم الشان روایت کی بنیاد رکھی۔ یہ سب لوگ آگے جا کر شعر و سخن اور صحافت کا معتبر حوالہ بنے۔ ان میں مراتب اختر، ناصر شہزاد، غلام فرید کاٹھیا، سعادت سعید، ایزد عزیز، سجاد میر، مجیب الرحمان شامی، اطہر ندیم، طارق عزیز، اشرف قدسی، تسنیم منٹو، شرافت نقوی، منظر ترمذی، فخر ہمایوں، خواجہ مہدی حسن، خواجہ عسکری حسن، قیوم صبا، گیلانی امجد، نسیم جوزی، امین رضا، منظور اعجاز، مشتاق صوفی، ڈاکٹر محمد امین، خالد طور، ریاض چوہان اور ڈاکٹر افتخار شفیع جیسی شخصیات پیدا کیں۔ ان کی وجہ سے اب ساہیوال علم و ادب کا مضبوط حوالہ بن چکا ہے۔

سید علی ثانی گیلانی

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ادبی منظرنامے میں ایک معتبر نام۔ اساتذۂ فن کے عہد رفتہ کی صدائے بازگشت۔ آپ کی ذات شہر ادب کے لیے ایک مینارۂ نور تھی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا ذکر آتے ہی ایک روحانی تازگی اور سرور کا احساس ہوتا ہے۔ آپ اساتذۂ کرام کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو علم کے ساتھ ساتھ فضل کے معاملے میں بھی تھے۔ موجودہ دور میں ایسی عظیم ہستیاں ناپید ہو گئی ہیں۔ نسیم صاحب سرتاپا تصوف کی سچی روایت میں شرابور انسان تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ایسی شخصیات کا وجود معاشرے کے لیے غنیمت ہوتا ہے۔

باب نہم

اقتباسات از مضامین و کتب

''اردو کے منظوم قصے''، ادبی دنیا، شمارہ پنجم، لاہور

اگر ہم رشیوں منیوں کے اس قول کو ذہن میں رکھیں کہ کائنات رام کی لیلا ہے یا دانشوروں کے اس مقولے پر غور کریں کہ دنیا عناصر کا کھیل ہے تو کہانی کے اجزائے ترکیبی ہمیں روزِ ازل کے دھندلے افق پر ہی جلوہ گر نظر آ جاتے ہیں۔ تخلیقِ آدم کا واقعہ اسی کھیل کا ایک ایکٹ ہے جس میں کائنات اور اس کے مظاہر، پس منظر اور خدا، فرشتے، آدم اور شیطان کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں آدم ہیرو ہے اور ابلیس ولن۔ خدا ابلیس اور آدم کی یہ کہانی اصل میں خود زندگی کی کہانی ہے۔ غالباً اسی لیے زندگی اور کہانی کو توام بھی کہا جاتا ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہے اور جہاں کہانی ہے وہاں کسی نہ کسی طرز کی زندگی کا ہونا لازمی ہے۔ چاہے یہ ماورائی اور طلسماتی ہی کیوں نہ ہو۔ انسان نے جب بھی اشاروں، کنایوں، لفظوں یا حرکتوں سے کوئی کہانی کہی ہے وہ اصل میں اس وسیع اور متنوع زندگی ہی کا کوئی نہ کوئی عکس لیے ہوئے ہوتی ہے۔ زندگی کے پھیلے ہوئے کینوس کے ہر کونے اور ہر گوشے سے چوں کہ ہر انسان علمی یا عملی طور پر آشنا نہیں ہوتا اس لیے وہ کہانیاں کہہ سن کر ان ان جانی اور ان دیکھی سمتوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ کہانیوں کے ان شش جہاتی آئینوں میں انسان کی پہلودار زندگی ہی کوئی نہ کوئی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ جس کی تاریکی، خوفناکی اور تنگی سے کبھی تو انسان گھبرا اٹھتا ہے اور کبھی روشنی، لطافت اور شیرینی سے مسحور ہو کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے متضاد قوتوں کی داخلی اور خارجی پیکار کے تاروں یا امید و یاس اور شادی و غم کے طربیہ اور المیہ دھاگوں سے بنی ہوئی حریر دورنگ جہاں وہ خود دیکھ پاتا ہے اسے وہ دوسروں کو بھی دکھانا چاہتا ہے یہ جذبہ اس میں جبلی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس وقت بھی کہانیاں کہتا اور سنتا تھا جب اظہارِ خیال کے ابھی واضح ذرائع پیدا نہیں ہوئے تھے اور آج بھی کہانیوں سے پیار کرتا

ہے، جب تہذیب اپنے پورے شباب پر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابتداء میں کہانیوں کا موضوع اور ان کے کہنے سننے کا انداز کچھ اور تھا اور اب کچھ اور ہے۔ کہانی کا یہ سفر برگ زباں، سینہ روایات اور لوح تحریر پر پھیلا ہوا ہے۔ مقالے کے اعتبار سے ہمارا تعلق سفر کی تیسری منزل اور اس میں سے بھی خصوصاً ان راہوں سے ہے، جہاں سے ناقہ، داستان رقص کناں گزری ہے اور جہاں اس کی رفتار کے آہنگ اور تواز ن نے اس کے نقوش قدم کو رشتہ نظم میں منسلک کر رکھا ہے۔

منظوم قصے اور کہانیاں ہر زبان کی ادب کا مایہ ناز سرمایہ رہا ہے۔ جدید کہانی یعنی ناول اور افسانے کی ایجاد سے پہلے نثری داستانوں کے ساتھ چھوٹی بڑی منظوم حکایتیں اور داستانیں لکھنے کا رواج ہر جگہ عام تھا۔ اہل اردو کے یہاں تو ادب کا یہ رخ بہت روشن تھا۔ ناول اور افسانے کے ساتھ نثر کی شرط اور زندگی کے"""محدود و مخصوص" "مفہوم کی قید نے کچھ ایسا سحر کیا ہے کہ داستان چھوڑ ڈرامے نے بھی قالب بدل لیا ہے۔ داستان تو ایسی غائب ہوئی ہے کہ اب نہ نثر کے صحرا میں نظر آتی ہے، نہ نظم کے گلزار میں ہر طرف افسانے کے شگوفے اور ناول کے پھول دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں داستان کی ویران روشوں کو کون خاطر میں لائے۔ لیکن نگاہ تامل دیکھتی ہے کہ یہ خس و خاشاک حقیقت میں کسی گزرے ہوئے قافلہ بہار کی آسودہ گرد ہے جسے اہل معنی آج بھی زبان کے سہاگ کا سیندھور اور ادب کے ماتھے کا جھومر سمجھتے ہیں۔

""خواجہ میر درد کی شاعری"، غیر مطبوعہ مقالہ مملوکہ ڈاکٹر سعادت سعید

تہذیب و اخلاق کا تعلق علم ظاہر یعنی شریعت سے ہے۔ تزکیہ نفس ایک انسان کے ذاتی نظم و ضبط اور زہد و عبادت کا نتیجہ ہے۔ اور عرفان الٰہی علم باطن سے حاصل ہوتا ہے۔ جو صرف اہل طریقت کے سینوں میں محفوظ ہوتا ہے۔ اور مرشد اس امانت کو اپنے مریدوں کے سینوں میں منتقل کرتا ہے۔ فلسفہ کا دخل تصوف میں اس وقت ہوا۔ جب یہ علم سینوں سے نکل کر بحث کا موضوع بنا۔ اور جس کے نتیجے میں منصور کو دار پر لٹکایا گیا۔ شمس تبریز کی جان گئی۔ سرمد شہید کیے گئے اور دیگر بے شمار نے اس راز کے فاش کرنے کی سزا پائی۔

مقصود کہنے سے یہ ہے کہ تصوف محض ان چند فلسفیانہ مباحث تک محدود نہیں۔ جو آج کل بعض

لوگ "خیر و شر"، "کثرت و وحدت" اور "وجود و شہود" کے عنوانوں سے ہمارے سامنے بار بار پیش کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی زد میں شریعت کے مسائل، نفس پر ضبط کے طریقے اور "فلسفیانہ" صوفیانہ مسائل سب آ جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اس وسیع موضوع کے صرف ایک پہلو تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھیں گے اور نہ ہی ان تمام شرعی مسائل کو اس ضمن میں بیان کرنے کی کوشش کریں گے جو براہ راست تصوف سے وابستہ نہیں بلکہ ہم ان تمام مباحث و مسائل کا جائزہ لیں گے جو ایک صوفی کو تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور عرفان الٰہی کی منزلوں میں پیش آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اگر ان مباحث و مسائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے اور خواجہ میر درد اور دیگر صوفیائے کرام کے ان خیالات کا ذکر کیا جائے یا ان اقتباسات کو درج کیا جائے جو ان لوگوں کی تصانیف میں ملتے ہیں تو مقالہ بے حد طویل ہو جائے گا اس لیے ہم نے جہاں ہر مسئلہ کی مختصر مگر واضح تشریح کی ہے وہاں حاشیہ میں خواجہ میر دردؒ کے خصوصاً اور دیگر مقتدر عالی شان صوفیا کی تصانیف اور ارشادات کے عموماً حوالوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔

- -

"چند تمہیدی مباحث"، مقالہ پی ایچ۔ ڈی، اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۵۸ء

اس مقالے کی غرض و غایت جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اردو شاعری کے مذہبی اور فلسفیانہ عنصر سے بحث کرنا ہے مذہب کیا ہے؟ اور فلسفہ کسے کہتے ہیں ان سوالات کے جواب میں (اس مقالہ کے نقطۂ نظر سے) ہمیں مذہب اور فلسفہ کی ان متعدد اور اختلافی تعریفوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے جو مشرق و مغرب کے علما اور حکماء نے وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے رکھی ہیں۔ بلکہ اس موقعہ پر ان کے متعلق چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ ہماری موجودہ بحث میں سب سے زیادہ قابل توجہ بحث موضوعات کا ہے۔ یعنی مذہب و فلسفہ کے وہ کون سے موضوع ہیں جن سے براہ راست یا ضمناً اردو شاعری نے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ مذہبی ماحول اور افکار نے خالص ادبی روح کو (خیالات اور اسالیب دونوں میں) کہاں تک متاثر کیا ہے، اسی طرح فلسفہ اور تصوف نے۔ عام حالات میں مذہب اور فلسفہ سے الگ کر کے دیکھنا محال ہے۔ اس کے لیے اول

ہم اجمالاً یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب اور فلسفہ کیا ہے؟ مذہب: ہر انسان اپنے سے کسی برتر ہستی (خواہ وہ دیوتا ہو یا اوتار، خدا ہو یا اس کا کوئی اور مظہر) عالم غیب، حیات بعد الممات اور خیر و شر کے بارے میں کچھ مخصوص اعتقادات رکھتا ہے۔ یہی اس فرد واحد کا مذہب ہے جس کا خارجی اظہار وہ ایک خاص نہج کی رسوم، عبادات، اور احکام کی پابندی سے کرتا ہے۔

مذہب کل ہے اور تصوف جز۔ کل کہہ کر تو ہم جز مراد لے سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جز کو کل سے خارج سمجھیں۔ اخلاقیات ایک اور ایسی کڑی ہے جو مذہب اور تصوف میں گہرا رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ "اخلاقیات وہ علم ہے جس میں کردار پر بہ حیثیت خیر و شر یا خطا و ثواب بحث کی جاتی ہے"۔ مذہب کی تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اخلاق الٰہی سے متصف کرے۔ تصوف کی جو تعریفیں سننے میں آتی ہیں ان میں بھی اخلاق کو اساسی درجہ حاصل ہے۔ اس پہلو سے بھی ہم مذہب اور تصوف کی ہم آہنگی سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تصوف کے اہم موضوعات مثلاً دیدار ذات، تجلی، رویا، کشف، الہام، مراقبہ، کرامت، توحید، وحدت، وحدانیت، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، اعتکاف، ذکر، فنا، بقا، روح، فضیلت انسانی، بے اعتباری حیات، صبر، قناعت، توکل، رضا، حلم، انکساری، ہمدردی، سلوک وغیرہ مذہب کے موضوعات ہیں۔ اگر فرق کہیں ہے تو صرف ان تک رسائی میں ہے۔

فلسفہ کب وجود میں آیا؟ اس کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویبر کہتا ہے کہ مذہب فلسفہ کا پیشرو ہے لیکن شوپنہار مذہب و فلسفہ کو توام بتاتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک فلسفے کی ابتدا حیرت سے ہوئی اور ہربرٹ کے نزدیک شک سے۔ حیرت اور شک دونوں چیزیں انسان میں شروع سے موجود تھیں۔ جب وہ فطرت اور اس کے گوناگوں کرشمات کو دیکھتا تو حیرت زدہ ہو کر ان کی توجیہ چاہتا اور ان کے مقابلے میں اپنی ہستی کے مقصد اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا اور سوچنے لگتا کہ یہ دنیا، یہ زمین، یہ آسمان آخر سب کچھ کیا ہے؟ یہ کس نے تخلیق کیے گئے ہیں؟ ان کے بنانے اور چلانے میں کس کا ہاتھ ہے؟ میں خود کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ اور کہاں چلا جاؤں گا؟ اس قسم کے خیالات، خواہ ان کی نوعیت کتنی ہی غیر منضبط اور منتشر کیوں نہ ہو ابتدا ہی سے انسان کے لیے دردِ سر بن گئے تھے۔ اگر چہ وہ ابھی اس قابل نہ تھا کہ عقل اور استدلال سے ان گتھیوں کو سلجھا سکے لیکن ان گتھیوں کی قدیم سے قدیم زمانے میں موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں پیچ در پیچ

الجھنوں کو عقل کے ذریعے کھولنے اور سمجھنے کے باضابطہ علم و عمل کا نام بعد میں فلسفہ رکھا گیا۔ فلسفہ، ایلفرڈ ویبر کے الفاظ میں ''فطرت کے ایک جامع نقطۂ نظر کی تلاش اور اشیا کی ہمہ گیر توجیہ کا نام ہے۔۔۔فلسفہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ دنیا کیوں موجود ہے اور جیسی یہ ہے ایسی کیسے ہوگئی؟ ۔۔۔'' اگر فلسفے کو علت اولیٰ کی تلاش کہا جائے تو اس کی تعریف میں الہیات یا مابعد الطبیعات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کے معنی مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں۔ یونانیوں نے فلسفہ کا ایک وسیع تصور قائم کر رکھا تھا۔ ان کے نزدیک فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الہیات وغیرہ سب کچھ شامل تھا مثلاً ارسطو کے نزدیک سائنس بالقوی فلسفہ ہے اور فلسفہ بالفعل سائنس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے جوہر، اعراض، مبتدا اور منتہا کے لحاظ سے فلسفہ اور سائنس میں گہرا تعلق ہے اور سائنس اور فلسفہ کی نئی نئی تحریکیں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں بلکہ محرک کا کام دیتی ہیں لیکن دونوں کے عمل میں کافی فرق ہے۔ سائنس اشیا کے اجزا کا تجزیہ کر کے ان کی ماہیت کا پتہ چلاتی ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتی ہے کہ فلاں چیز کیا ہے۔ فلسفہ اس کے برعکس بتاتا ہے کہ اس کی یہ ماہیت کیسے اور کیوں ہے۔ یہ حقائق اشیا کے ادراک کا نام ہے۔ زمانہ حال کے اروپائی حکما اور علما نے ان تمام مسائل کو جو مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو چکے ہیں سائنس کا نام دیا ہے۔ اور جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا ہے۔

''چندا: اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ'' ماورینٹل کالج میگزین'' لاہور، فروری ۱۹۶۰ء

خدا نے شاعری کا ملکہ ودیعت کرنے میں اگر چہ مرد و زن کی تخصیص نہیں کی لیکن اس میں شک نہیں کہ دنیا کی ہر زبان کے شاعروں کی غالب اکثریت مردوں کی رہی ہے۔ اس کے جہاں اور وجوہ ہو سکتے ہیں ایک بڑی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ عورت کی فطری حیا انسان کے متنوع خیالات اور متلون جذبات کے اظہار کے راستے میں حائل رہی ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں اور زبانوں کی شاعری کے سلسلے میں یہ بات پورے طور پر درست نہ بھی ہو اسلامی مشرق خصوصاً ہندی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں غور طلب ضرور ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں عورت کا مقام جب تک کلی طور پر پس دیوار رہا، اردو شاعرات کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کی شہادت ان تذکروں

سے بھی ملتی ہے جو اردو شاعری کے آغاز سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک کے شاعروں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے دو تذکرے، ایک خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا ''گلشن گفتار''، اور دوسرا بھی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا ''چمنستان شعرا'' تو جنوبی ہند میں لکھے گئے ہیں اور باقی دہلوی ماحول کی پیداوار ہیں۔ دہلی میں لکھے جانے والے تذکروں میں میر کے ''نکات الشعرا''، قیام الدین قائم کے ''مخزن نکات''، اور فتح علی گردیزی کے تذکرہ ''ریختہ گویاں'' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان سب تذکروں کے اوراق کی سیاہی میں صنف نازک کا ایک نام بھی چمکتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ نواب درگاہ قلی خان نے اپنی مشہور تصنیف ''مرقع دہلی'' میں بارہویں صدی ہجری کی جو رنگین تصویر کھینچی ہے اس میں بھی جہاں ارباب نشاط اور بعض دوسرے اہل فن اور شاعروں کے مختلف رنگ جھلکتے ہیں کسی اردو شاعرہ کا نقش نظر نہیں آتا۔

سیاسی اور اقتصادی حالات کے تحت جب اردو شاعری کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوا تو یہاں پہلی دفعہ چند شاعرات منظر عام پر آئیں۔ جن میں سے کچھ تو شہزادیاں تھیں اور کچھ بازاری عورتیں۔ غلام ہمدانی مصحفی نے ''تذکرہ ہندی گویاں'' میں ان میں سے پانچ چھ کے حالات لکھے ہیں۔ لکھنؤ میں شاعرات کا وجود وہاں کی اس مخصوص تہذیب اور منفرد معاشرت کا مرہون منت ہے جو شاہ اودھ کے زمانے میں پیدا کی گئی۔ اس معاشرے میں عورت اور مرد کے درمیان وہ آہنی پردے اور اونچی دیواریں حائل نہ رہی تھیں جو دہلوی تہذیب کا خاصا تھا اور عورت پردے سے نکل کر تیزی سے میلے ٹھیلوں، عرس تماشوں، مجلسوں اور سیرگاہوں بلکہ کوٹھوں کی زینت بن رہی تھی اور امرا و شرفا طوائفوں اور رنڈیوں سے راہ و رسم رکھنے کو معاشرت کا ایک ضروری جز تصور کرنے لگے تھے۔ فیض بخش نے تاریخ ''فرح بخش'' اور غلام علی نے ''عماد السعادت'' کے نام سے شاہان اودھ کے حالات لکھے ہیں ان میں پادشاہوں اور رعایا کی رنگینی طبع کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے مضمون '''' مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' میں تو بڑی وضاحت سے سب کچھ لکھا ہے۔ آخری شاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کی زندگی اور تصانیف میں بھی لکھنؤ کی اندر سبھاؤں کے مرقعے موجود ہیں۔ اردو اصناف سخن میں ریختی کی اختراع بھی عورتوں کے ساتھ اسی کھیل کھیلنے کا نتیجہ ہے۔ ایسی فضا میں جہاں انشاء اللہ خان انشا، سعادت یار خان رنگین اور جان صاحب نے عورتوں کی زبان اپنے منہ میں لے کر شاعری میں چٹخارے لیے اور قلندر بخش جرات نے معاملہ بندی کے پردے میں صنف نازک

کے ساتھ چوما چاٹی کے مزے لوٹے۔ خود عورتوں نے بھی جذبات دل کے اظہار میں کوئی جھجک یا شرم محسوس نہ کی اور پھر جب دہلی اور لکھنؤ کی سلطنتوں کے سقوط کے بعد مغربی تمدن کی عام رو نے اخلاقی قدروں کو بالکل نئے زاویے بخشے تو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کئی شاعرات پیدا ہونے لگیں اور ان کے حالات و کوائف پر باقاعدہ تذکرے لکھے جانے گئے۔ ایسے تذکروں میں کریم الدین کے تذکرہ "گلدستہ ناز"، عبدالحی صفا کے تذکرہ "شمیم سخن" اور درگا پرشاد نادر کے تین تذکروں: "تذکرہ گلشن ناز"، "تذکرہ چمن انداز" اور "تذکرہ بہارستان ناز" کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تذکروں میں جن عورتوں کا ذکر ہے وہ معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں شہزادیوں اور شریف زادیوں سے لے کر رنڈیوں اور طوائفوں تک کے نام دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر ان میں کثرت ایسی شاعرات کی ہے جن کا سرمایہ شعری چند اشعار، غزلوں یا نعتوں سے زیادہ نہیں۔ باقاعدگی سے شعر کہنے والی عورتیں گنتی کی ایک دو ہیں اور ان میں ایک طوائف ماہ لقا متخلص بہ چندا کا نام اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے باقاعدہ اپنا دیوان مرتب کیا ہے اور غالباً اس میدان میں اولیت کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔

"خواجہ میر درد کے کلام میں نظامِ تصوف کی تلاش"، "اورینٹل کالج میگزین" لاہور، ۱۹۶۰ء

ایک ایسے شاعر کے کلام میں، جس کا سارا سرمایہ (ایک دو چیزوں کو چھوڑ کر) غزل پر مشتمل ہو، کسی خاص پیغام، نظریہ یا نظام کا تسلسل کا ڈھونڈنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ غزل اپنی روایات اور تقاضوں کے اعتبار سے اس قسم کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً کلاسیکی غزل میں تو یہ بات بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ لیکن خواجہ میر درد کے متعلق اس جسارت کا خیال مجھے اس وقت آیا جب ان کا یہ شعر میری نظر سے گزرا:

پھولے گا اس زباں میں بھی گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

اس شعر نے مجھے ان کے کلام کو، ایک خاص نقطۂ نظر سے پڑھنے پر مجبور کیا اور جب نظر کا یہ نقطہ ایک دفعہ روشن ہوا تو پتہ چلا کہ ہم جنہیں رنگ برنگ موتی سمجھتے ہیں حقیقت میں ایک ہی تسبیح کے

بکھرے ہوئے دانے ہیں۔ ضرورت صرف ایسے رشتے کی ہے جس میں انھیں رنگ، شکل اور اوصاف کے لحاظ سے آگے پیچھے پرویا جا سکے۔ یہ رشتہ میری کوشش نے مہیا کیا ہے۔

تصوف کی یوں تو بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میں ان سب میں الجھ کر موضوع سے دور جانا نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک تصوف کی غایت وجدان یا عشق کے ذریعے حقیقت مطلق کے ادراک یا اس زندگی ہی میں ذات سے روح کے امکان وصال کا نام ہے۔ ایک صوفی کی ساری جد و جہد دیدار ذات کے لیے ہوتی ہے جس کے حصول کے لیے اسے ہزاروں روحانی تجربات یا صوفیا کی اصطلاح میں مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز حیرت ہے اور منزل مقصود وصال ذات۔ خواجہ میر درد کا کلام اس مسلک کے بڑے بڑے مقامات کی شاعرانہ تفصیل ہے۔

براؤننگ نے ایک خط میں لکھا ہے کہ تمام شاعری ''لا محدود'' کو ''محدود'' میں مقید کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ قول خواجہ میر درد کی شاعری پر جس بھرپور نوعیت سے صادق آتا ہے اردو شاعری میں ایک مثال شاذ ہے۔

شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

خواجہ میر درد کے شب و روز کی طرح ان کے خیالات اور ان کا بیان بھی اسی چیز کے لیے وقف ہے۔ حقیقت محض کے ادراک اور اس زندگی میں ذات مطلق سے روح کے امکانی وصال کا خیال، ہر شخص کے دل و دماغ میں نہیں ابھرتا۔ اس کے لیے خاص ذہن، قلب، استعداد، اور صلاحیت کے انسان کی ضرورت ہے۔ ایسا انسان، حیرت، اضطراب، اور تجسس کی دولت ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ دولت ہے جو اسے تصوف جیسی گراں بہا اور کمیاب شے خریدنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسا شخص محض اپنے ''پیدا ہو جانے'' پر مطمئن نہیں ہوتا اور اپنی تخلیق کو ایک حادثہ سمجھ کر خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی پیدائش کے مقصد کائنات کی تخلیق کے سبب اور خالق سے تعلق جیسے سوالات کو اپنے دماغ میں جگہ دیتا ہے اور ان کے حل کی پہلی ذہنی اور پھر عملی کوشش کرتا ہے۔

استعجاب، تجسس اور اضطراب کے اس مرحلے سے، ہر صوفی کی طرح، خواجہ میر درد بھی گزرے ہیں۔ ان کے کلام میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ہمیں ان کی ابتدائی ذہنی الجھنوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کائنات کی ہر چیز بلکہ سارا ماحول ان کے لیے حیرت گاہ بنا ہوا

ہے۔ وہ ہر شے کی حقیقت کو جاننے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں لیکن ان کے لیے سب سے زیادہ اضطراب زا چیز موت ہے یہی وہ مسئلہ ہے جس پر جو انسان جتنا زیادہ غور کرتا ہے اتنا ہی اپنی حیات، کائنات، اور خالق کی حقیقت پانے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔

"اردو کی قدیم مذہبی مثنویاں"، رسالہ ادبی دنیا، شمارہ ہفتم، لاہور

مذہب اگرچہ بنیادی طور پر انسان اور خدا یا کسی اور برتر ہستی کے تصور و تعلق تک محدود ہے۔ لیکن اس تصور و تعلق کے بعد انسان مختلف قسم کے عقائد و اعمال کی جو ذمہ داری اٹھا لیتا ہے اور ان کو بروئے کار لانے میں اسے جو اقدام کرنے پڑتے ہیں وہ سب مذہب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے مذہب اگر داخلی اعتبار سے عقائد کا نام ہے تو خارجی لحاظ سے اعمال و معاملات کا مظہر ہے ہمارے ہاں مذہب کے ان دو رخوں کے لیے ایمان اور اسلام کے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ جو غیب پر یقین اور ارکان شرعی کی بجا آوری اور معاملات کی درستی پر مشتمل ہیں۔ غیب پر یقین جب مشاہدے کی آنکھ کا حق بن جاتا ہے تو احسان کہلاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام معرفت ہے۔ مشرب تصوف کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہے۔ اس رو سے مذہب ایک ایسا کل ہے جس میں ایمان (یعنی غیب پر یقین) اسلام (یعنی ارکان شرعی اور معاملات) اور معرفت (یعنی مشاہدہ حق) کے اجزا شامل ہیں۔ میں نے اس مقالے میں مذہب کے اسی دائرہ عمل کو پیش نظر رکھا ہے اس لیے کہ اس میں جس ادبی دور کی مذہبی مثنویوں کا کھوج لگایا گیا ہے اس پر صرف مذہب اسلام کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

اس دور کو عام طور پر اردو شاعری کا قدیم دور کہا جاتا ہے جس کے آسمان پر اردوئے معلی شاہجہاں آباد کے آفتاب کی بجائے علاقائی شکلوں کی کہکشاں پھیلی ہوئی ہے۔ آج زمانے کے طویل فاصلے کی تاریکی میں اس کہکشاں کا نور اگرچہ بہت ہلکا دکھائی دیتا ہے لیکن کبھی اس میں مطلع صبح نشور کی تابانی ہوگی۔ آج وہ عالم نہ سہی پھر بھی دنیائے اردو کا کوئی نظارگی اس سے بے خبر نہیں گزر سکتا۔ یہ کہکشاں شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی ہے۔ شمال میں اس کا نشان بہت مدہم ہے لیکن جنوب میں اس کی جلوہ گری عیاں بھی ہے اور عام بھی۔ جس سے دکنی اور گجری زبانوں کی شعاعیں نکل کر ایک وسیع علاقے اور طویل زمانے کو روشن کر رہی ہیں۔ لسانی اعتبار سے ان زبانوں کو ہم اردو کے سامنے

کہتے ہیں جا ہے یہ سائے نوری کے کیوں نہ ہوں۔ ان سایوں سے نہ صرف اردو زبان و ادب کے وقار میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کی عمر میں بھی کئی سو سال بڑھ گئی ہے۔ دکنی اور گجری پر کام کرنے والے کئی فاضلوں نے ہمیں ان زبانوں کے ادب سے بخوبی واقف کرایا ہے۔ اور کرا رہے ہیں۔ اور وہ سرمایہ ہمارے لیے واقعی حیران کن اور حیرت افزا ہے جو صحرائے ادب کے ان اہراموں سے نکل رہا ہے۔ اس سرمائے میں عشق کے لعل، حسن کے نگینے، دین کے زمرد، تصوف کے عقیق اور اخلاق کے موتی سب کچھ ہے۔ نظر تحقیق و تجسس کا مذہبی جوہری جب اس سرمائے سے اپنا حصہ الگ کرنا چاہتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس خزانے کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جہاں سے تجلی طور کی جلوہ گری نہ ہو رہی ہو، لیکن پھر بھی شعیب سے کلیم تک کے فاصلے میں قدموں کے جو نشان، صحرائے سینا، وادئ سینا اور طور سینا پر الگ الگ نظر آ رہے ہیں، ان سے منزلوں کی تفریق کی جا سکتی ہے۔ شجر طور کی منزل خالص مذہبی منزل ہے جہاں مثنویوں کی چھال، قصیدوں کے برگ، قطعات کے شگوفے اور مرثیوں کی شاخیں پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں مثنویوں کی وہی حیثیت ہے جو درخت پر چھال کی ہوتی ہے جس طرح چھال کے بغیر درخت کے سوکھنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس طرح اگر اس دور سے مثنویوں کو الگ کر دیا جائے تو باقی سرمایہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ ان مثنویوں کی چار بڑی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

(الف)۔ خالص مذہبی یا دینی مثنویاں جن میں عقائد و تصورات، ارکان شرع اور مسائل فقہی کا ذکر ہے۔
(ب)۔ اخلاقی مثنویاں جن میں مذہبی پند و نصائح، معاملات و حقوق اور امر و نواہی کی باتیں ہیں۔
(ج)۔ صوفیانہ مثنویاں، جن میں مذہب کے باطنی رخ کی تصویریں ہیں۔ (د) سیرتی اور قصص مثنویاں جن میں پیغمبروں اور بزرگوں کے سوانح اور قصے ہیں۔

میر حسن کی مثنوی "رموز العارفین" رسالہ، اُردو، کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء

مثنوی رموز العارفین کی ایک خاص ہیئت و ترکیب ہے جس میں مثنوی مولانا روم کی طرح مختلف حکایات و روایات کو ایک ترتیب اور مقصد سے جمع کر دیا گیا ہے۔ دکنی دور میں اس سے مشابہ چند مثنویاں مثلاً وجیہ الدین وجدی کا پنچھی باچا اور دو تین دوسری مثنویاں ابراہیم ادھم کے بیان میں

مل جاتی ہیں، لیکن ان کے علاوہ اس دور کی تمام صوفیانہ مثنویاں یا تو ایک مسلسل واقعہ کی صورت میں ہیں یا محض چند نصائح کے خطابی اور واعظانہ انداز میں اور پھر یا کسی مذہبی صوفیانہ یا علم کلام کے مسئلہ پر منطقیانہ پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر الذکر دونوں صورتوں میں قصہ پن بالکل مفقود ہے۔ شمالی ہند کی جن ایک دو صوفیانہ مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اسی نوعیت کی حامل ہیں۔ میر حسن کے قریبی زمانہ میں راسخ عظیم آبادی نے جامی کی "سبحۃ الابرار" کی بحر میں ایک صوفیانہ مثنوی "نور الانوار" کے نام سے لکھی لیکن اس کی طرز یہ ہے کہ اس میں مختلف منظرے قائم کیے گئے ہیں اور ان میں حکایات وتشبیہات کے ذریعے تصوف واخلاق کے مختلف مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ مثلاً منظر ششم در صفت عبادت بہ شرکت یک حکایت۔ منظر ہفتم در صفت بندگی بہ شرکت یک حکایت۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ حکایت ایک ہی ہو۔ منظر بست وسوم در بیان احوال خاصان مقربان حضرت خداوند تعالیٰ شانہ کہ شور عشق بے مثال وجمال لایزال از ازل در سر دارند بہ شرکت یک حکایت" اور اس کے بعد ایک کہانی کی بجائے لگاتار سات کہانیاں درج ہیں۔ پہلے کچھ اشعار موضوع متعلقہ کی نسبت درج ہیں اس کے بعد حکایات لکھی ہیں۔ اول سے آخر تک مثنوی کا یہی انداز ہے۔ اس کی ہیئت اور ترکیب کچھ ڈراما کے مختلف ایکٹوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ یہ میر حسن کی مثنوی "رموز العارفین" کے ڈھنگ سے قریب تر ہے لیکن بعد کی تصنیف ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں جہاں تک ایک خاص طرز کی صوفیانہ مثنوی گوئی کا تعلق ہے، اگر پورے دور کے لحاظ سے نہیں تو کم از کم شمالی ہند میں میر حسن کی اولیت ضرور مسلم ہو جاتی ہے۔

مثنوی "رموز العارفین" اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے مصنف کے ذاتی اعتقادات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے۔ میر حسن کے جد امجد میر امامی شہر ہرات کے سادات عظام میں سے تھے۔ ان کے والد میر ضاحک میر امامی کے پوتے اور میر عزیز اللہ کے بیٹے تھے۔ اردو میں میر خلیق، انیس، اور نفیس ہوئے۔ اس خاندان کا میلان جیسا کہ ان بزرگوں کی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے شیعہ مذہب کی طرف زیادہ تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ شیعہ ہی تھے۔ لیکن میر حسن کی اس مثنوی سے ان کے معتقدات کے متعلق بعض نقادوں نے شک کا اظہار کیا ہے۔

''مولانا عظامی سے میرا تلمذ'' مطبوعہ رسالہ فردا، بزم فکروادب، ساہیوال

جو لوگ عصرنو کے دریچوں میں بیٹھ کر بھی دنیائے قدیم کا تماشا کرنے کے عادی ہیں ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اور جہاں کہیں مجھے پرانا ماحول اور قدیم طرز کے لوگ نظر آتے ہیں۔ میرے دریائے جذبات میں ایک ایسا پرکیف ارتعاش پیدا ہوتا ہے جسے میں صرف محسوس کرسکتا ہوں بیان نہیں کرسکتا۔ اس قسم کا جذباتی ارتعاش میں نے اس وقت محسوس کیا تھا جب مجھے پہلی بار مولانا عظامی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

۔۔۔۔۔ عظامی صاحب کو دیکھ کر میں نے یوں محسوس کیا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے نے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ابھی میں تاثر کے اس جہاں میں تھا کہ میرے کانوں میں آواز آئی ''محترم خیریت ہے'' اور ساتھ ہی ایک کمزور ہاتھ میری طرف بڑھا۔ میں نے شکریہ کہہ کر مصافحہ کیا اور تیزی سے انھیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ان کو اس طرح دیکھتے ہی میرے جذبات میں اس قسم کا ارتعاش پیدا ہو جس کا ذکر میں شروع میں کرچکا ہوں مجھے وہ تبرک معلوم ہوئے جو دیکھنے میں تو قلیل ہوتا ہے لیکن قیمت میں انمول۔ میں نے عرض کی۔

''پیرومرشد فقیر تو آپ کے قدیم نیاز مندوں میں سے ہے اور ایک عرصہ سے زیارت کی خواہش تھی آج خوش بخت آرزو کو سرراہ پاکر سجدے میں گرنے کو جی چاہتا ہے''

ساتھ ہی میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھ دیا۔

در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے

شعر سنتے ہی ان کی بجھی ہوئی مولیں کچھ ابھریں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی طبیعت میں ایک جوش سا پیدا ہوگیا ہے۔ کہنے لگے ''عزیزم سخن دوست معلوم ہوتے ہیں'' میں اس ''بھتان'' کا بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اتنے میں ماسٹر نیاز صاحب بول پڑے کہ یہ کالج میں استاد ہیں۔ اردو پڑھاتے ہیں یہ شعر بھی کہتے ہیں'' ماشاءاللہ'' عظامی صاحب کے منہ سے نکلا اور پھر قدرے توقف کے بعد فرمانے لگے۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے اچھی مناسبت ہے بھی طبیعت لگے تو اس میں بھی کچھ کہا کرو'' میں نے عرض کی ''قبلہ یہ کام تو راہنمائی چاہتا ہے اگر آپ خضر راہ بنیں تو آب حیات پانا کونسی مشکل بات ہے'' کسر نفسی سے کہنے لگے'' بھئی ہم یہ ذمہ داری اٹھانے کے قابل کب ہوئے''

میں نے بھی جواب میں تلفظاً کچھ فقرے کہے اور اس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔ اسی رات جب میں بستر پر گیا تو عظامی صاحب کی تصویر پھر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ ان کے نحیف جسم میں اس قسم کا وقار، تقدس اور عظمت تھی جو صدیوں پرانے کسی مسجد کے مینار میں ہوتی ہے۔ خاص طور پر ان کی وضع داری نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ سر پر عثمانی ترکوں کی یادگار رکھا والا سرخ رنگ یعنی ترکی ٹوپی، بدن پر سفید اور ڈھیلی آستینوں والا کرتا اور شرقی شلوار، کمر اور کندھوں کے گرد لپٹا ہوا ململ کا پٹکا "پاؤں میں ویسی ساخت کی جوتی۔ خیال آیا:

پیدا کہاں ہے ایسے پراگندہ طبع لوگ

تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں کس استقامت سے انھوں نے اپنی قدیم وضع کو قائم رکھا ہے۔ اس احساس نے ان کی عظمت میرے دل میں اور بڑھادی۔ میرے لیے یہ ایک بات ان کی شخصیت کی جان تھی۔ سوچا کیوں نہ ان کی صحبت سے استفادہ کیا جائے۔ اور فارسی میں کہنے کی جسارت کر کے کیوں نہ بحیثیت شاگرد ان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرسکوں۔ اس خیال کے آتے ہی اندر سے ایک آواز نے کہا "کیا تم میں اس کا کوئی جواب ہے تو میں نہ سوچ سکا۔ البتہ گنگنانا شروع کر دیا اور بے تابی کے اس خارستان کو سونے سے پہلے غزل کے ایک گلدستے سے سجادیا۔

"خاندان شاہ ولی اللہؒ کا حصہ" (اردو ادب کی ترویج میں)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد باغ دہلی کی بہار جس طرح لٹی اور گردش زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے حسن و جمال کو جس طرح برباد کیا اس کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ حوادث کی یورش نے شیرازۂ امن و عافیت کو منتشر کر دیا اور جمعیت خاطر اور اطمینان قلب کی دولت یوں نابید ہوگئی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ اس میں بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ ہاں کچھ ایسے بھی تھے جن کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی، جو تیز و تند ہواؤں میں بھی اپنا چراغ جلاتے رہے۔ ان میں بعض درویش صفت اہل علم اور ذی علم اہل دل خصوصاً قابل ذکر ہیں جن کی اچھی خاصی تعداد اس وقت دہلی میں موجود تھی۔ شاہ عبدالعزیزؒ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں:

"دراں ہنگام بزرگان بسیار و اولیائے بسیار از یاران والد ماجد در مسجد بودند"۔

ان کے علاوہ شاہ کلیم اللہ چشتی جہاں آبادیؒ، شاہ گلشن دہلویؒ، خواجہ محمد زبیر نقشبندیؒ، مولانا فخر الدین فخرؒ، جہاں شاہ جہاں آبادیؒ، شیخ عبدالاحد سرہندیؒ، مرزا مظہر جان جاناںؒ اور ان کے مشائخ و مرید، خواجہ ناصر عندلیبؒ اور ان کے بیٹے، خواجہ میر دردؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور ان کے فرزندوں کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے جانشینوں نے اس پرآشوب زمانے میں جہاں دین اور علمِ دین کو اپنی اجتہادی کوششوں سے سہارا دیا۔ ادب و شعر اور تصنیف و تالیف کی طرف بھی ایک حد تک توجہ کی۔ مولف "حیاتِ ولی" شاہ ولی اللہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"گیارہویں صدی کے شعرا کی فہرست میں آپ کو ڈھونڈتے ہیں تو نہایت روشن اور جلی حرفوں میں آپ کا نام ثبت پاتے ہیں۔ فارسی میں ان کی غزلیں بھی ہیں اور قصائد بھی۔ قصیدہ کسی کی شان میں نہیں بلکہ در بعضے معارف نامہ"۔

مولانا شاہ رفیع الدینؒ کے متعلق مولانا ابو الحامد محمد اسمٰعیل صاحب گودھرویؒ اپنی تصنیف "ولی اللہ" میں لکھتے ہیں(۱) کہ

"وہ کبھی کبھی اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ چوتھی صدی کے فاضل بوعلی سینا نے نفس کے متعلق ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے دندان شکن جواب دیا تھا۔ شاہ رفیع الدین صاحب نے اس نظم کو مخمس کی صورت میں ڈھال دیا۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ایک زبردست قصیدہ لکھا ہے"۔

سرسید احمدؒ نے بھی "آثار الصنادید" میں لکھا ہے کہ۔

"حضرت (یعنی رفیع الدینؒ) کی نظم و نثر زبان عربی میں بہت ہے"

مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے ان خطوط میں جو انھوں نے اپنے چچا حضرت شاہ اہل اللہؒ کے نام لکھے ہیں کئی جگہ اس زمانے کے تاثرات اور اپنے احساسات کا اظہار عربی نظم میں کیا ہے۔ مولانا شاہ عبدالقادر کے عربی فارسی کلام کا ذکر کسی نے واضح طور پر نہیں کیا البتہ سرسید احمدؒ نے یہ لکھا ہے کہ

"آپ کا کلام دستیاب نہیں ہوا"

عربی و فارسی اشعار کے علاوہ ان زبانوں میں نثری کتابوں کی ایک معقول تعداد بھی ان بزرگوں سے یادگار ہے صرف یہی نہیں بلکہ فارسی اور عربی اقلیمِ سخن سے نکل کر انھوں نے ہندی ولایت

کی سیر بھی کی اور نظم اردو میں کچھ ایسے اجتہادی قدم اٹھائے کہ جن کی نشان دہی سے بعد کے لکھنے والوں نے مستقل نئی راہیں پیدا کیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے زمانے میں دہلی کی دنیائے ادب و شعر میں اردو کا نیا نیا چرچا ہوا تھا۔ بعض لوگ اس کی ثقاہت پر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن بقول آزاد اہل نظر بھانپ گئے تھے کہ یہ آج کی چھوکری کل کی محفل کی رونق بننے والی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی دوررس نگاہ نے اس نکتہ کو پا لیا اور اپنے فرزندوں کو بچپن میں میر دردؒ کے گھرانے میں بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ اصول زبان سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے بچوں کو کہا کرتے تھے کہ "جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے۔ اور اردو زبان کے مجتہد خواجہ میر درد صاحبؒ ہیں۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو"۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اپنی کتاب "کمال فکر کی ایک جھلک" کے حوالے سے "رود کوثر" میں لکھا ہے کہ

"شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد کی خدمت میں بچپنے سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر سنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چنا کرتے تھے" اس کی تائید مولانا محمد حسین آزاد کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر انھوں نے آب حیات میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا گھرانا اور یہی خواجہ میر دردؒ کا خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے یعنی میر دردؒ کے والد مرحوم کے زمانہ میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے۔ ایک دن اس جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اس لیے سب سامنے حاضر تھیں۔ باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچے تھے مگر ان کا تبسم اور طرز دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب مائیں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ مادّیں بہنوں کو عوام الناس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے۔ خواجہ صاحب خاموش رہے"

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عبدالعزیزؒ بچپن میں خواجہ میر دردؒ اور ان کے والد کی صحبتوں میں جایا کرتے تھے۔

اگر خاندان شاہ ولی اللہؒ کے بزرگ مذہبی تنگ نظری اور مولویانہ کٹرپن سے کام لیتے اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں شاعروں کو اس "فن قبیح" سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تو یقیناً اردو ادب کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود اردو ادب کے طرف توجہ کر کے اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کر کے ان بزرگوں نے اردو زبان اور ادب پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جہاں تک میری تحقیق نے ساتھ دیا میں نے شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے ان تمام افراد کا ذکر کر دیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی رنگ میں اردو زبان و ادب سے رہا ہے۔ ممکن ہے بعد کی تحقیق ان ناموں یا ان سے منسوب اردو تصانیف میں کچھ اور اضافہ کر سکے لیکن ایک حقیقت مسلم ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک ان حضرات کے نثری کارناموں کا تعلق ہے وہ تاریخ ادب اردو میں ایک مستقل تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے پہلے شمالی ہند میں نثر کی ابتدا ہو چکی تھی۔ فضلی کی "دہ مجلس" اور چند دوسری تصانیف اس سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ لیکن شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے تراجم قرآن اپنی نوعیت کی اولین تصانیف ہیں اور اسی طرح شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویت الایمان" اور مولانا اسحٰق کی "مشکوۃ ہندی" کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ اسلوب بیان کے لحاظ سے آج ہم ان تصانیف کو شاید خاطر میں نہ لائیں لیکن اردو نثر کے ارتقا میں ان کا اپنا ایک الگ مقام ہے اور ہم اس منزل پر ٹھہرے بغیر آگے نہیں گزر سکتے۔

"اقتباس از پیش لفظ" تذکرہ الہ زار، غیر مطبوعہ مملوکہ ڈاکٹر سعادت سعید

مجھے یہاں نہ مرثیہ کا تعارف و تعریف بیان کرنا ہے اور نہ اس کی تاریخ وارتقا پر روشنی ڈالنا ہے کیوں کہ یہ کام ناچیز سے بہت زیادہ اور بہت احسن طریقہ سے ہو چکا ہے۔ مجھے تو صرف اردو کے شاعران کربلا شار کو اس طرح اور اس ترتیب سے جمع کرنا ہے کہ ان میں سے ہر پچھتانا ایک ہی قافلہ کا فرد نظر آئے۔ نہ کوئی کارروائی نظر آئے اور نہ کوئی امیر کارواں۔ سب کے سب غم حسین علیہ السلام میں اشک بار دکھائی دیں اپنے آغاز سفر سے لے کر اب تک یہ سفر ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے جب تک دشت کربلا کے ذرے موجود ہیں خون شہدائے کربلا کا رنگ اردو شاعری کو رنگین کرتا رہے گا۔

اس آنے والے سفر میں اشک خونیں بہانے والوں کا ذکر نہ جانے کس کی قسمت بنے میں نے تو اردو کے قدیم دور سے لے کر عہد حاضر تک کی چشم ہائے خونبار میں جھانکا ہے اور اس طرح جو تصویریں میری سامنے آئی ہیں ان کے مرقع کو میں نے "تذکرہ لالہ زار" کا نام دے کر نذر حسین علیہ السلام کر دیا ہے۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔

یہاں یہ عرض بھی کر دوں کہ اس تذکرہ میں وہ جملہ مرثیہ نگار نہیں ہیں جو آپ کو تواریخ و تذکار کی کتابوں میں ملیں گے۔ میں نے صرف ان کو قلم بند کیا ہے جو میری تحقیق و مطالعہ کی دسترس میں آئے ہیں۔ ایسی مرکزی جگہ پر نہ ہونے کی بنا پر جہاں کتب خانے ہیں اور ہر قسم کی کتابوں سے آراستہ ہیں۔ میں سب شاعروں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکا۔ مثال کے طور پر چند تذکروں کے صرف تخلص مع صفحات میرے پاس محفوظ تھے۔ ان کے حالات میری پہنچ سے باہر تھے۔ ان کی میں نے ایک فہرست دے دی ہے۔ قارئین ان تذکروں سے ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

"ارکان اسلام: کلام اقبال کے آئینے میں"، غیر مطبوعہ مملوکہ ڈاکٹر سعادت سعید

اس خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کے بعد جس نے مشت خاک کو ایمان کی دولت نصیب کی اور اس کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت و نعت کے بعد جن پر نبوت و رسالت ختم کر دی گئی اور دین کو مکمل کر دیا گیا۔ فقیر بے گلیم ڈاکٹر الف۔ د نسیم یوں رقم طراز ہے کہ میرا آبائی وطن اور مولد ہوشیار پور شہر (مشرقی پنجاب۔ بھارت) ہے جو کوہ شوالک کے دامن میں واقع ہے اور جسے خطہ پنجاب کا باغ کہا جاتا تھا۔ یہاں تا حد نظر آموں کے باغ تھے جن میں شب و روز مور ناچتے اور کوئلیں کوکو کرتیں۔ یہ فارسی کے مشہور شاعر مولانا گرامی مرحوم کا مدفن اور آبائی رشتہ میں میرے بھائی حفیظ ہوشیار پوری کا مولد و وطن ہے۔۔ میرے خاندان کے مورث اعلیٰ سلطان محمود غزنوی رحمتہ اللہ علیہ یا ان کے بعد آنے والے افغان لشکروں میں سے کسی ایک لشکر کے ساتھ باجوڑ سے ہوتے ہوئے ہند میں داخل ہوئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کا تعلق یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ گگہ زئی سے تھا۔ شمالی ہند کے کئی شہروں، قصبوں اور دیہات کی طرح یہ شاخ ہوشیار پور شہر میں خوب پھولی پھلی۔ اس شاخ سے وابستہ افغان یہاں شیخ (سردار) کہلاتے تھے۔ میرے بزرگ نہ جانے

کب سے یہاں آباد تھے۔ میرے شباب تک پہنچنے کے ساتھ ہی اس شاخ کی آبیاری کرنے والا شہر
ہوشیار پور بھی پنجاب کے دوسرے شہروں، قصبوں اور دیہات کی طرح تقسیم ہند کے موقع پر پیدا
ہونے والے فسادات کی نذر ہو گیا اور میں اپنے عزیز و اقارب کی معیت میں آگ اور خون کے دریا عبور
کرتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ یہاں میں نے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی اور جامعہ پنجاب سے ایم اے اردو کی
سند حاصل کرنے کے بعد بطور استاد گورنمنٹ کالج ساہیوال (سابقہ منٹگمری) میں آ گیا۔ گو ریٹائر ہو
چکا ہوں لیکن ابھی تک یہیں ہوں۔ مٹی نہ جانے کہاں کی ہے۔ میں اب زندگی کے اس حصے میں ہوں
جسے کوئی شاخ پر خشک پتے سے تشبیہ دیتا ہے اور کوئی چراغ سحری سے تعبیر کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ
اکہتر برس کی عمر میں مجھے زیر نظر کتاب "ارکان اسلام: کلام اقبال کے آئینے میں" لکھنی نصیب ہوئی
ہے اور میں نے اس یقین کے ساتھ لکھی ہے کہ یہ ان شاء اللہ دین اسلام سے ناواقف یا کم واقف
مطالعہ اقبال کرنے والوں کے لیے روشن بصیری اور روشن ضمیری کا کام دے گی اور میرے لیے توشہ
آخرت بن جائے گی۔۔ اپنی درویش صفت والدہ کی تربیت، فقیر منش والد کی شفقت اور اپنے پیرو
مرشد خواجہ محمد دیوان رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہ فیض عطا کے طفیل ابتدائے سن شعور ہی سے اسلام کی طرف جو
میری رغبت تھی یہ اسی کا ثمر ہے کہ ساری عمر حسن و عشق کی باتیں کرنے اور پڑھانے والا اردو کا یہ
ناکارہ استاد آج ارکان اسلام جیسے دقیق، نازک اور مقدس پہلو کو نبھانے کے قابل ہوا ہے۔ اس میں
میری قرآن و حدیث کی اس تھوڑی بہت سمجھ کا بھی عمل دخل ہے جو علمائے صلحا کی دینی اور صوفیانہ کتابوں
اور بعض درویشوں کی صحبت کے طفیل حاصل ہوئی ہے۔۔ کرم صحبت بزرگان نے جہاں تک مجھے کلام
اقبال کا فہم عطا کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے ابتدائی دور کے سوا ان
کا سارا کلام قرآن و سنت کے پس منظر میں ہے انھوں نے اپنے متعلق "غزل سرا نیم و پیغام آشنا گویم
" کی جو بات کی ہے اس میں یہی اشارہ دیا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا منبع اللہ اور اس کے
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں ہے۔ اس کے سوا اگر کسی کو کلام اقبال میں کچھ اور نظر آتا ہے تو وہ
اس کی اپنی فہم کا قصور ہے۔ جو شاعر خدا سے مخاطب ہو کر یہاں تک کہہ دے کہ اگر میں نے قرآن
کے سوا کچھ اور کہا ہو "روز محشر خوار و رسوا کن مرا" اس کے کلام میں اس سے ہٹ کر کچھ اور ڈھونڈنا
عبث ہے۔۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے اس دعویٰ کے پس منظر میں جب میں نے کلام اقبال کا نئے
سرے سے مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے سارے دھاگے کو چاہے اس کا رنگ پکا (اصلی) ہو یا

کیا (فروغ) ارکانِ اسلام کی گوٹ کے گرد لپیٹا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر زیرِ نظر کتاب میں، میں یہ عمل
کرتا تو علامہ کی ساری کتابوں کو ایک کتاب میں سمونا پڑتا جو کسی لحاظ سے بھی ممکن نہ تھا۔ اس لیے مجھے
مختلف موضوعات کے لیے بنیادی اور نمائندہ اشعار کو ڈھونڈنا پڑا جو بذاتِ خود باریک بینی کا کام تھا۔
یہ بات برصغیر کے مسلمانوں کا ایک قومی المیہ ہے کہ وہ انگریز غاصب کی ریشہ دوانیوں اور اس کے
مسلمان گماشتوں کی سازشوں کی وجہ سے اپنے دین سے دور اور اپنے ثقافتی ورثے سے غافل ہو گئے
۔ اس عمل بے دینی، مختاری اور گمراہی پسندی میں تیزی اس وقت آئی جب کیمونسٹ روس نے ترقی
پسندی کی تحریک کے نام سے ایک سیاسی، ثقافتی اور ادبی محاذ کھول دیا اور اللہ والوں کی رہی سہی متاعِ
دین و دانش اس کی کافر نگاہی نے لوٹ لی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور
دانش وروں نے مغرب زدہ ذہن کو ساتھ ملا کر "روایت سے بغاوت" کی ایک ایسی تحریک چلائی
جس سے مسلمان اپنے شاندار ماضی، عظیم انسانی قدروں اور دینی و روحانی ورثے سے غافل ہوتا چلا گیا
اور اسے یہ بھی پتہ نہ رہا کہ وہ کس آسمان سے ٹوٹا ہوا تارا اور کس شجرِ ثمردار کی شاخِ بریدہ ہے۔ یہ اسی
کا نتیجہ ہے کہ آج اپنی روایت کی طرف لوٹنے والے مسلمان پر بنیاد پرستی کی پھبتی کسی جا رہی ہے اور
اپنے ثقافتی، لسانی اور ادبی ورثے کی بات کرنے والے کو قدامت پسند اور دقیانوسی کہا جا رہا ہے۔ ایک
ہی ملک میں ایک سے زیادہ قومیتوں کے نعرہ کی آڑ میں علاقائی بولیوں کو مسلمانوں کی قومی زبان اردو
اور ثقافتی زبان فارسی کے مقابلے میں لا کر ان زبانوں کو قربان کیا جا رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو کیا جا
چکا ہے۔ یہی وہ شب خون ہے جسے نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا اور آج پوری قوم علامہ اقبال کے اصل پیغام
سے محض اس لیے ناواقف ہے کہ وہ فارسی سے نابلد ہے، عربی نا آشنا ہے، اردو گریز ہے۔ زیرِ نظر
کتاب کے سلسلے میں میرے سامنے یہ مسئلہ بھی رہا کہ علامہ کے کلام میں سے جو زیادہ تر فارسی میں
ہے، فارسی اشعار کی مثالیں دینا فارسی نابلد قاری کے لیے کس طرح سودمند ہو سکتا ہے۔ آخر فیصلہ یہی
کرنا پڑا کہ فارسی اشعار تو ضرور دیے جائیں لیکن جہاں ضروری ہو ان کا اردو ترجمہ بھی ساتھ دے دیا
جائے۔ اس صورت سے کتاب کی ضخامت تو قدرے ضرور بڑھی ہے، لیکن ایسا نہ کرنا اندھے کو چراغ
دکھانے کے برابر ہوتا۔ قارئین کرام سے یہ بھی درخواست ہے کہ اگر وہ کتاب میں درج فارسی اشعار
کے تراجم کو اصل فارسی عبارت کے الفاظ کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھیں گے تو انھیں علامہ کے فارسی
اشعار چاہے وہ فارسی زبان نہ بھی جانتے ہوں خود بخود سمجھ میں آنا شروع ہو جائیں گے، کیوں کہ

علامہ کی شعری فارسی بڑی سلیس اور آسان فہم ہے۔

پیش لفظ: "نسیم رحمت"، غیر مطبوعہ مملوکہ ڈاکٹر سعادت سعید

اس خدائے پاک کی حمد کے بعد جس نے مشت خاک کو ایمان کی دولت بخش اور اس کے حبیب پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ وسلام کے بعد جس کی بعثت ایمان بخشی کا سبب بنی عبد ضعیف ڈاکٹر الف۔ د نسیم یوں عرض پرداز ہے کہ میری نعتوں کا پہلا مجموعہ بنام نسیم طیبہ قارئین کی نگاہ عقیدت اور نظر تنقید سے گزر چکا ہے دوسرا مجموعہ نسیم رحمت کے نام سے پیش خدمت ہے۔ پہلے مجموعہ کی طرح اس مجموعہ کی نعتیں بھی میرے ذاتی اور میرے عقیدہ و دیا کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا عکس ہیں۔ نعت دراصل مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے نظم میں ہو یا نثر میں ------- کسی کی صحیح مدح اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے مقام اور اس کی شان کا صحیح ادراک ہو۔ جب خدا کے سوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ اور شان کو جاننے والا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں تو پھر ان کی نعت میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ کم ہے بقول حضرت حسان رضی اللہ تعالی عنہ ہم تو نعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیان کر کے اپنے مرتبہ کو بلند کر کے اپنے مرتبہ کو بلند کرتے ہیں نہ کہ ان کے مرتبہ کو۔

نعت دراصل مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے نظم میں ہو یا نثر میں۔ کسی کی صحیح مدح اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے مقام اور اس کی شان کا صحیح ادراک ہو۔ جب خدا کے سوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ اور شان کو جاننے والا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں تو پھر ان کی نعت میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ کم ہے بقول حضرت حسان رضی اللہ تعالی عنہ ہم تو نعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیان کر کے اپنے مرتبہ کو بلند کرتے ہیں نہ کہ ان کے مرتبہ کو۔

پہلے مجموعہ کی طرح میں اس میں بھی سوت کی انٹی لے کر یوسف کے خریداروں میں شامل ہونے والی بڑھیا کی طرح نظر آؤں گا مجھے نہ شاعرانہ فخر بیان کی برابری کا دعوی ہے اور نہ نعت گو شاعروں کی ہمسری کا -------- قارئین کرام سے درخواست ہے کہ کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیں اور کوئی لغزش ہے تو اصلاح کر دیں۔

"اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ مصطلحات"، غیر مطبوعہ، مملوکہ ڈاکٹر سعادت سعید

اس خالق کائنات کی حمد و ثنا کے بعد جس نے کن فیکون سے ایک عالم ایجاد کیا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا اور اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد جن کو اللہ کی طرف سے کان ما یکون "کا علم عطا کیا گیا بندہ عاجز خاک پائے علما و صلحا اللہ دتا تخلص بہ نسیم جس کا ادبی نام الف۔ د۔ نسیم ہے اور جو اپنی ہیچ مدانی کے باوجود انگریزی دور کے تعلیمی انتظام کے تحت ڈاکٹریٹ (پی۔ ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کرنے کی بنا پر ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے نام سے معروف ہے عرض پرداز ہے کہ آج سے صدی ڈیڑھ صدی پہلے فارسی یا اردو کا باد ادب ادیب اور شاعر بننے سے پہلے علوم مروجہ یعنی دین (قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ) طب، ریاضی، نجوم، منطق کی تھوڑی بہت سدھ بدھ ہونے کے ساتھ ساتھ چند علوم ادب میں مہارت تامہ بھی حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اس کے لیے کسی استاد شاعر اور صاحب علم و فضل کا دامن بھی پکڑنا پڑتا تھا۔ اور قدیم اساتذہ عربی و فارسی کے دواوین بھی پڑھنے پڑتے تھے۔ بعد میں اردو کے استاد شاعروں کے دواوین، اور کلیات کا مطالعہ بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یہ صورت حال کم از کم مرزا غالب مرحوم کے دور تک ضرور رہی ہے۔ یہ علوم ادب جن سے آشنا ہونا ایک ادیب اور شاعر کے لیے ضروری تھا علم زبان، علم لغت، علم صرف، علم نحو، علم روزمرہ محاورہ، علم ضرب الامثال، علم عروض، علم قوافی، علم شعر، علم معانی، علم صنائع، علم بیان، علم نقد، وغیرہ تھے۔ انقلاب زمانہ دیکھیے کہ آج ان میں سے کسی بھی علم سے جزوی یا کلی عدم واقفیت اور بے استاد ہونے کے باوجود لوگ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، محقق بھی ہیں اور نقاد بھی اس کے علاوہ ذاتی اور خاندانی شرافت جو فن ادب اور پیشہ شاعری اختیار کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی وہ بھی جدیدیت کی وادی غیر ذی زرع میں گم ہو کر رہ گئی ہے جس کے نتیجے میں عہد حاضر کے ادب و شعر میں ادبیت اور شعریت کی حقیقی چاشنی مفقود ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں وہ بے لطفی اور معنوی بے مزگی بھی پیدا ہو گئی ہے جسے صرف ذوق سلیم ہی محسوس کر سکتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم علوم و ادب کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ جدیدیت کی بظاہر روشن مگر بباطن سیاہ تحریک کے سبب شرف زبان و بیان اور مجد معانی و مضامین کا جو تنزل ہوا ہے اسے محسوس کرتے ہوئے ان کا وقار پھر سے بحال کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ مغربی تہذیب و ثقافت اور اشتراکی بے دینی کی غیر انسانی

اور غیر فطری یلغار سے ان کے بچے کھچے سرمایہ کو بچایا جائے اور ان کا رخ پھر سے مشرقی اور اسلامی قدروں کی طرف موڑا جائے۔ یہ کتاب اسی تحریک وابسی کا ایک معمولی اجزائی قدم ہے۔ اسے میں نے معمولی قدم اس لیے کہا ہے کہ ان ضمنی علوم ادب میں سے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے میں نے صرف ایک علم یعنی علم صنائع (علم بدیع) کا انتخاب کر کے اس میں سے صرف ایک صنعت یعنی صنعت تلمیح کو لیا ہے اور اس کتاب کے پہلے حصے کی عمارت صرف اسی پر تعمیر کی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر ایک علم ادب کے صرف ایک عنوان کو لے کر اتنا مواد جمع کیا جا سکتا ہے تو باقی علوم میں کیا کچھ نہ ہو گا۔ علم صنائع جسے اہل عجم نے علم بدیع بھی کہا ہے شاعرانہ صنعتوں سے بحث کرتا ہے۔ ان صنعتوں کے استعمال سے نہ صرف یہ کہ شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے بلکہ شاعر اپنے مافی الضمیر کو زیادہ خوبی سے بیان کر سکتا ہے۔ اس علم سے بہت سی لفظی اور معنوی صنعتیں وابستہ ہیں میں نے ان میں سے صرف ایک لفظی صنعت کو اس کتاب کا موضوع بنایا ہے اور اس کا نام صنعت تلمیح ہے یہ اردو اور فارسی شاعری میں کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ صرف اسی ایک صنعت پر جمع کردہ مواد سے قاری پر میرے اس دعوی کی حقیقت منکشف ہو جائے گی جو میں نے مذکورہ بالا سطروں میں قدیم و جدید کی بحث کرتے ہوئے کیا ہے۔

باب دہم

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم
(مراحل و منازل حیات)

اسم گرامی: اللہ دتہ نسیم

قلمی نام: الف نسیم / اے ڈی نسیم

والد محترم: جناب شیخ شیر محمد (ان کا شمار شہر کے معزز کاروباری حضرات میں ہوتا تھا۔ زندگی کے صدمات اور بیماریوں کے باعث بینائی جاتی رہی اور گھریلو ذمہ داریوں کا بار گراں ان کے بڑے صاحب زادے، ہماری موضوعہ شخصیت الف۔ د۔ نسیم کے نازک کندھوں پر آن پڑا)

والدہ: رمضان بی بی (ایک درویش صفت خاتون)

خاندان: عبدالعزیز (برادر خورد) حمیدہ بیگم (بہن) محمودہ بیگم (بہن)
(اللہ دتہ نسیم نے چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائی اور انھیں اس دور کے رواج کے مطابق تعلیم دلوائی۔ بہن بھائیوں کی تعلیم اور شادیوں کے فرائض سے سبک دوش ہوئے)

سال پیدائش: ۱۹۳۰ء محلہ شیخاں (ہوشیار پور)

سال وفات: ۲۰۰۲ء لاہور

مدفن: قبرستان میانی صاحب

اہلیہ محترمہ: ثریا بیگم (۲۰۰۲ء) شہر کے علمی و ادبی حلقوں میں اماں جان کے نام سے معروف تھیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی رشتہ دار تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند، باشرع اور راست فکر۔ اپنے بچوں کی پرورش احسن طریقے سے کی۔ شوہر کے وفات کے بعد اپنے فرزند طاہر نسیم کے گھر اسلام آباد مقیم ہو گئیں۔ وہیں انتقال ہوا۔ تدفین لاہور میں ہوئی اور اپنے شوہر کے پہلو میں قبرستان میانی صاحب میں دفن ہو گئیں۔

اولاد: ڈاکٹر سعادت سعید: معروف شاعر اور ادیب۔ ممتاز پروفیسر جی سی یونیورسٹی لاہور
حسن جاوید (۲۰۰۲ء) سیاسیات کے استاد۔ وفات کے وقت ایف سی کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔
طاہر نسیم: ٹیکی کارپوریشن، ٹاؤن اینڈ سیڈ وِنگ اسلام آباد کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔
طاہرہ بتول (زوجہ ابو حسن)
شاہد نسیم: سعودی فرانس بینک میں افسر، حال مقیم الریاض (سعودی عرب)
طیبہ بتول (زوجہ اظہر نسیم)

بیعت: سلسلۂ چشتیہ
سائیں خواجہ دیوان رحمتہ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حافظ کرم بخش چشتی صابری رحمتہ اللہ علیہ
(تو سلم سائیں لالہ دیوان چند) ہوشیار پور
حضرت غلام محی الدین بابو جی رحمتہ اللہ علیہ (آستانہ عالیہ گولڑہ شریف)

سکونت: ۸ ے۔ حالی روڈ، نزد گول چکر۔ ساہیوال

تعلیمی مراحل: میٹرک: گورنمنٹ ہائی سکول ہوشیار پور
ایف۔ اے: ہوشیار پور
بی۔ اے: پنجاب یونیورسٹی بعد از منشی فاضل
ایم۔ اے اردو: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
مقالہ بعنوان: ''خواجہ میر درد: حیات اور فن''

نگران: ڈاکٹر سید عبداللہ

پی ۔ ایچ ۔ ڈی اردو: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور مقالہ بعنوان "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" نگران: ڈاکٹر سید عبداللہ

اساتذہ: مرحبہ اللہ دین، سید عبداللہ، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، سیتا رام کوہلی، مولانا عزیز الدین احمد عقائی (شاگرد مولانا گرامی)، آغا بیدار بخت

شاگرد: ناصر شہزاد، طارق عزیز (نیلام گھر والے)، مراتب اختر، ے زیڈ کے شیردل، سعید اختر، میاں محمد مرغوب، اشرف قدسی، ناصر شہزاد، تسنیم سعد، صوا طیر ندیم، شرافت نقوی، ابرار ترمذی، فخر ہمایوں، پروفیسر قمر الزمان خان، خواجہ مہدی حسن، خواجہ عسکری حسن، قیوم صبا، سجاد میر، مجیب الرحمٰن شامی، یحییٰ امجد، فہیم جوزی، منظور اعجاز، اشتاق صوفی، ڈاکٹر محمد امین، ڈاکٹر انوار احمد، خالد طور، قاضی حبیب الرحمٰن، مظہر ترمذی، ڈاکٹر غیر صمدانی، میاں یٰسین خان وٹو، میاں منظور احمد وٹو، اقبال نکا، چوہدری ممتاز علی خان، راؤ آفتاب احمد، رانا غلام ربانی، چوہدری نور ریز شکور، ریاض پوسوال، چوہدری محمد شفیق، سردار علی احمد میر، یامین رضا، پروفیسر قمر الزمان خاں

حلقۂ احباب: سید منظور احمد مجور نقشبندی، مکان شریفی، شیخ عطاء اللہ خان جنوں، میاں ظہور احمد، مجید امجد، ن م راشد، منیر نیازی، ظفر اقبال، گوہر ہوشیارپوری، یٰسین قدرت، نواب اکرم خان قمر، بشیر احمد بشیر، حکیم محمود رضوی، جعفر شیرازی، سید ریاض حسین زیدی، محمد مرغوب۔

ملازمت: لیکچرار شعبہ اردو: گورنمنٹ کالج منٹگمری (ساہیوال) ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۳ء

صدر شعبہ اردو: گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۳ء

صدر شعبہ اردو: گورنمنٹ کالج ساہیوال ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۸ء

(سرکاری ملازمت سے سبکدوشی بطور اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو)

استاد شعبہ اردو: صادق پبلک سکول بہاولپور ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۱ء

تصانیف: ۱۔ نسیم طیبہ، مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۳ء
۲۔ نسیم رحمت زیر طبع
۳۔ نسیم غزل زیر طبع
۴۔ مجھے ہے حکم اذاں (مجموعہ رباعیات) زیر طبع

تنقید و تحقیق: ۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (بطور شریک مصنف)
۲۔ خواجہ میر درد: حیات و فن (تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو) زیر طبع
۳۔ اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر زیر طبع
۴۔ اردو کے قدیم اور چشتی صوفیا، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
۵۔ بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء
۶۔ اردو شاعری میں مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات، زیر طبع
۷۔ اردو فکشن: مشرقی اقدار کی روشنی میں، زیر طبع
۸۔ اردو کے چند مرثیہ نگار، زیر طبع
۹۔ اردو شاعروں کے معاشقے، زیر طبع
۱۰۔ خواجہ میر درد کے شاگرد، زیر طبع
۱۱۔ تذکرۂ لالہ زار، زیر طبع
۱۲۔ اردو فکشن مشرقی اقدار کی روشنی میں، زیر طبع (داستان، ناول، ڈراما)
۱۳۔ خواجہ میر درد (کتابیات)، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
۱۴۔ موج نسیم (خودنوشت سوانح عمری)، مطبوعہ ادبی مجلہ "ساہیوال" گورنمنٹ کالج ساہیوال، گولڈن جوبلی نمبر، ۱۹۹۵ء

اقبالیات: ۱۔ اقبال اور مسئلہ وحدت الوجود، بزم اقبال، لاہور
۲۔ اقبال اور ارکان اسلام، بزم اقبال، لاہور
۳۔ شرح کلیات اقبال، قاری بشیر اینڈ سنز، لاہور

مدحیات: ۱۔ نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مکتبہ عالیہ، لاہور

۲۔ حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مکتبہ عالیہ، لاہور

۳۔ مسئلہ درود وسلام، مکتبہ نسیم لاہور

۴۔ امداد اللہ مہاجر مکی کا پیغام، مکتبہ نسیم لاہور

خطاب: محبِ اردو (از ڈاکٹر سید عبداللہ)

ادارت: ادبی مجلہ "ساہیوال" (گورنمنٹ کالج ساہیوال)

صدارت: انجمن تحفظ اردو پاکستان

جامعات میں نسیم شناسی کی روایت:

۱۔ "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی ادبی خدمات"

تحقیقی مقالہ برائے ایم اردو، مقالہ نگار: سمیرا جہانگیر، جامعہ پنجاب، سن ۱۹۹۲ء

۲۔ "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بطور محقق اور نقاد"

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، مقالہ نگار: سید عبدالوحید، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، سال ۲۰۰۹ء

۳۔ "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و ادبی خدمات (مشرقی اقدار کی روشنی میں)"

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مقالہ نگار: صابری نور مصطفیٰ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، سال ۲۰۱۰ء

اعزازات ۱۔ شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کے پہلے گولڈ میڈلسٹ، ۱۹۵۰ء

۲۔ بطور ریسرچ سکالر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی پہلے پی ایچ ڈی (اردو) ۱۹۵۸ء

چند اہم مطبوعہ مضامین:

۱۔ خواجہ میر دردؔ کے کلام میں نظامِ تصوف کی تلاش

۲۔ خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں زندگی کا عنصر

۳۔ دہلی بارہویں صدی ہجری کا شاعرانہ ماحول (آدھی کتاب قسط وار شائع ہوئی)

۴۔ اردو کی قدیم صوفیانہ اور مذہبی مثنویاں، مطبوعہ رسالہ ادبی دنیا

۵۔ مثنوی رموز العارفین از میر حسن، مطبوعہ رسالہ اردو

۶۔ اردو کی حمایت میں، مطبوعہ رسالہ ادب لطیف

۷۔ خاندان شاہ ولی اللہؒ کا اردو کی ترویج میں حصہ، مطبوعہ رسالہ اردو

۸۔ اردو کے منظوم عشقیہ قصے، مطبوعہ رسالہ ادبی دنیا

۹۔ عصری تقاضے اور اخلاقیات، مضامین مطبوعہ ماہنامہ بہاولپور

۱۰۔ اقبال کا فن شعر (مسجد قرطبہ کی روشنی میں)، رسالہ نئی قدریں حیدرآباد

۱۱۔ محمد فقیہ دردمند کا ساقی نامہ، رسالہ نئی قدریں حیدرآباد

۱۲۔ اقبال: ایک ہمہ جہت شخصیت (متفرق مضامین)، رسالہ اقبال، بزم اقبال لاہور

۱۳۔ پاکستان میں اردو کی ترقی، مطبوعہ ادب لطیف

کتابیات

بنیادی ماخذات

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "اردو کے قدیم اور چشتی صوفیا"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۷ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "بارھویں صدی ہجری میں دلی کا شاعرانہ ماحول"، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا پیغام"، لاہور، مکتبہ نسیم، ۱۹۹۳ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "حیات نبی ﷺ" مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۲ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "خواجہ میر درد (کتابیات)"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۱ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "کلیات اقبال اردو"، لاہور، شیخ بشیر احمد اینڈ سنز، ۱۹۹۵ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "شرح کلیات اقبال فارسی"، لاہور، شیخ بشیر احمد اینڈ سنز، ۱۹۹۵ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ ندائے یا رسول اللہ شریف لاہور، مکتبہ نسیم، ۱۹۹۵ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال"، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۲ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "مسئلہ میلاد شریف" لاہور، مکتبہ نسیم، ۱۹۹۳ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "نسیم طیبہ"، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۳ء

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "نور مجسم ﷺ" مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۶ء

غیر مطبوعہ مسودات، ملکیت ڈاکٹر سعادت سعید

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "ارکان اسلام بفکر اقبال کی روشنی میں"

الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر: "اردو شاعری میں مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات و مصطلحات"

الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "اردو فکشن: مشرقی اقدار کی روشنی میں"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "تذکرہ کار لذار"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "خواجہ میر درد کے شاگرد"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "سادھو درویش"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "مجھے ہے حکم اذاں"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "مکاتیب نسیم"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "نسیم رحمت"
الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "نسیم غزل"

غیر مطبوعہ مقالات

الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "اردو شاعری فلسفیانہ و صوفیانہ عنصر" تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر: "خواجہ میر درد: حیات اور فن" تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

مطبوعہ مقالات

الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر (مقالات): "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان ہند جلد اول، دوم" ، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء

مطبوعہ تحقیقی مقالات

رسالہ اردو، ادبی دنیا، نقوش، اورینٹل کالج میگزین اور الہام وغیرہ میں مطبوعہ مقالات

ثانوی ماخذات

افتخار شفیع، سید علی ثانی گیلانی: "شہر غزل کے بعد"، ساہیوال، ادارہ صوت ہادی، ۲۰۰۹ء

تحسین حسن خان (مرتب)، "مقالاتِ تنقید و تحقیق"، علی گڑھ، ادارہ تالیفات اردو، ۱۹۵۶ء

ساجد امجد، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا تہذیبی اور تمدنی پس منظر"، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر (مرتبہ)، "اردو میں اصولِ تحقیق"، اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، ۲۰۰۳ء

علامہ محمد اقبال، "کلیاتِ اقبال فارسی"، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۹ء

گیان چند جین، ڈاکٹر، "اردو کی ادبی تاریخیں"، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء

محمد کامران، ڈاکٹر (مرتب)، "یہ دنیا امروز میری ہے"، لاہور، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۵ء

مولانا روم، "دیوان شمس تبریز"، غزل نمبر ۱۳۳۱، ویب سائٹ گنجور، تہران، س ن

رسائل و جرائد

ماہنامہ "ادب دوست"، جنوری ۱۹۹۸ء، مدیر اے جی جوش، لاہور

ماہنامہ "بیاض"، جولائی ۲۰۱۹ء، مدیر عمران منظور، لاہور

سہ ماہی "پیغامِ آشنا"، شمارہ ۲۶، ۲۰۰۷ء، مدیر محمد سلیم اختر، اسلام آباد

ادبی مجلہ "راوی"، ۲۰۱۳ء، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

ادبی مجلہ "ساہیوال"، گولڈن جوبلی نمبر، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ۱۹۹۳ء

ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج ساہیوال، ۲۰۱۹ء

ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج منٹگمری، ۱۹۲۹ء

ادبی مجلہ "ساہیوال"، گورنمنٹ کالج منٹگمری، ۱۹۲۶ء

ماہنامہ "صریر"، شمارہ ۱، سالنامہ ۱۹۹۳ء، مدیر ڈاکٹر فہیم اعظمی، کراچی

ادبی سلسلہ "فردا"، جولائی ۱۹۹۶ء، مدیر اشرف قدسی، ساہیوال

سہ ماہی "فکر و تحریر"، شمارہ ۱۲، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء، مدیر ڈاکٹر فہیم انیس، کولکتا

ادبی رسالہ "قندیلِ ادب"، ۲۰۰۸ء، مدیر سعد اللہ اسود، ساہیوال

ادبی سلسلہ "نعت رنگ"، ۲۰۱۷ء، مدیر سید صبیح رحمانی، کراچی

ادبی سلسلہ "نئی شاعری"، شمارہ اول، اگست ۲۰۱۹ء، مدیر ڈاکٹر سعادت سعید، لاہور

ڈاکٹر نسیم کے بارے میں غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات

سمیرا جہانگیر، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی ادبی خدمات"، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۹۳ء

صابری نور مصطفیٰ، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرقی اقدار کی روشنی میں"، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء

عبدالوحید، سیدہ "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بطور محقق اور نقاد"، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، سال ۲۰۰۶ء

اخبارات

روزنامہ "جنگ"، لاہور، ۲۱۔ اپریل ۱۹۹۳ء

روزنامہ "دنیا"، لاہور، ۱۸۔ جنوری ۲۰۲۱ء

روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۱۷۔ نومبر ۱۹۸۰ء

روزنامہ "جنگ"، لاہور، ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۱۹۔ نومبر ۱۹۸۰ء

انٹرویوز

سید ریاض حسین زیدی سے راقم کا انٹرویو، فرید ٹاؤن ساہیوال، ۲۳ جولائی ۲۰۱۹ء

ڈاکٹر سعادت سعید سے راقم کا انٹرویو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر منصور قریشی سے راقم کا انٹرویو، گل گشت کالونی ملتان، ۱۲ مارچ ۲۰۲۱ء

واصف سجاد سے راقم کا انٹرویو، گلستان کالونی ساہیوال، ۱۹ اپریل ۲۰۲۰ء

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
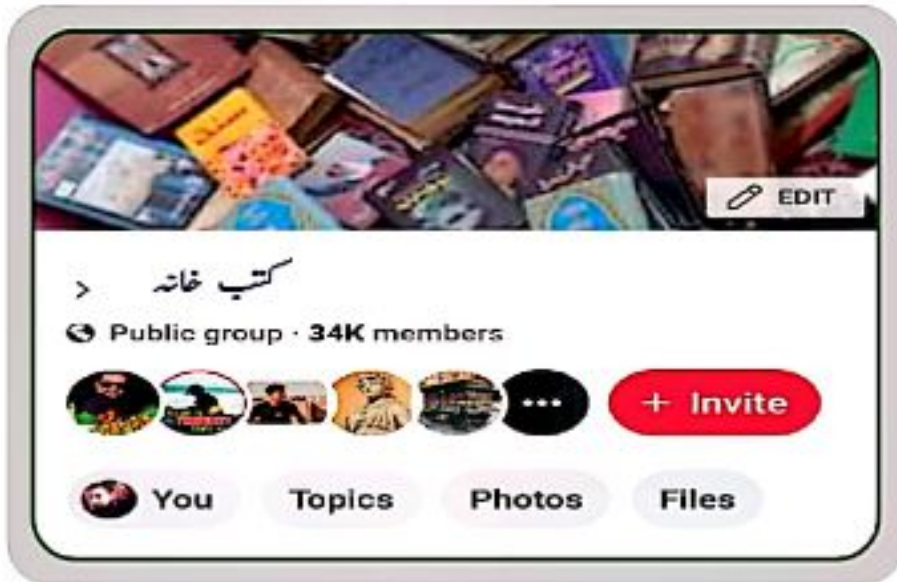
عقابی : +923055198538
محمد اطہر اقبال : +923340004895
محمد قاسم : +971543824582
میاں شاہد عمران : +923478784098
میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

اردو کے معروف شاعر، محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر محمد افتخار شفیع پاکستان کے شہر ساہیوال (منٹگمری) کی تاریخی درس گاہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں شعبہ اردو کے سربراہ ہیں۔ افتخار شفیع ۱۷ اگست ۱۹۷۳ء کو ساہیوال میں پیدا ہوئے، اسی شہر سے گریجویشن کی، ازاں بعد بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم۔اے اردو اور پھر ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کیا۔ ۲۰۰۵ء میں ہائیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ پنجاب میں اردو کے لیکچرر منتخب ہوئے۔ انھوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی کے مراحل اعزاز کے ساتھ طے کیے۔ افتخار شفیع کا ۲۰۱۶ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے لیکچرر سے براہِ راست بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو تقرر ہوا۔ افتخار شفیع کی ابتدائی پہچان ایک شاعر کی حیثیت سے ہوئی، ان کا کلام پاک و ہند کے معروف ادبی رسائل میں شائع ہوا، ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالات دونوں طرف کے معروف ادبی پرچوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ متعدد قومی اور بین الاقوامی علمی و ادبی کانفرنسوں میں بطور مقالہ نگار شرکت کر چکے ہیں۔ ان کی مختلف علمی و ادبی موضوعات پر پندرہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، اہم کتب میں نیلے چاند کی رات (شعری مجموعہ)، اردو ادب اور آزادیٔ فلسطین (تنقید و تحقیق)، اصناف شاعری (تنقید و تحقیق)، اصناف نثر (تنقید و تحقیق)، ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت و فن (تنقید و تحقیق)، اردو غزل میں سراپا نگاری (تنقید و تحقیق)، مجید امجد: نئے تعینات (تنقید و تحقیق)، پاکستانی ادب کا منظر نامہ (ترتیب)، آثار جنوں (تدوین و ترتیب)، حفیظ الرحمٰن خان: شخصیت اور فن (ترتیب)، کلیات نثر: مجید امجد (ترتیب) اور شواہد الالہام: مولانا حالی (تدوین) شامل ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی سلسلے "پاکستانی ادب کے معمار" کی کتاب "ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: شخصیت اور فن" ڈاکٹر محمد افتخار شفیع نے صدقِ محبت سے تحریر کی ہے۔